پانی پریشان
افسانے
سیّد احمد قادری

(افسانے)

سیّد احمد قادری

مکتبہ غوثیہ

۷/رنیو کریم گنج، گیا ۸۲۳۰۰۱، بہار (بھارت)

سکین بائے
عقابی

نام کتاب	:	پانی پر نشان
ناشر و مصنف	:	سید احمد قادری
پتہ	:	۷، نیو کریم گنج، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)
ای میل	:	dr_quadri54@yahoo.com
فون نمبر	:	0631-2422818
اشاعت	:	دسمبر ۲۰۰۶ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۱۵۰ روپے
کمپوزنگ	:	محمد اقبال قیصر، کہکشاں کمپیوٹر پریس، گیا
مطبع	:	پاکیزہ آفسیٹ پریس، پٹنہ۔۶

زیر اہتمام

مکتبہ غوثیہ

۷، نیو کریم گنج، گیا ۸۲۳۰۰۱ (بہار)

Paani Per Nishan

(SHORT STORIES)

by : Syed Ahmad Quadri

7. New Karimganj, Gaya (Bihar)

Year : 2006

Price : 150/-

ISBN : 81-902397-1-6

Published by :

MAKTABA GHOUSIA

7, New Karimganj, Gaya 823001 (Bihar)

انتساب

بیٹی

ثمرین

اور

فراز

کے نام!

جو دور

(امریکہ)

رہ کر بھی بہت

پاس ہیں!!

اس کتاب کی اشاعت میں محکمہ راج بھاشا، حکومت بہار کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔

ڈاکٹر سیّد احمد قادری۔ مختصر تعارف

نام	:	سیّد احمد قادری
نام والد	:	بدر اورنگ آبادی
تاریخ و مقام پیدائش	:	۱۱ر ستمبر ۱۹۵۴ء اورنگ آباد (بہار)
تعلیم	:	ایم.ایس سی.(بوٹنی)، پی.ایچ.ڈی.
ملازمت	:	استاذ شعبہ نباتات، مرزا غالب کالج، گیا

☆ ادبی تصانیف

ریزہ ریزہ خواب	:	(افسانوی مجموعہ)	۱۹۸۵ء
فن اور فنکار	:	(تنقیدی مضامین)	۱۹۸۶ء
دھوپ کی چادر	:	(افسانوی مجموعہ)	۱۹۹۵ء
افکارِ نو	:	(تنقیدی مضامین)	۱۹۹۶ء
اردو صحافت بہار میں	:	(تحقیق و تنقید)	۲۰۰۳ء
پانی پر نشان	:	(افسانوی مجموعہ)	۲۰۰۶ء
افسانہ نگار اور افسانے	:	(تنقید)	(زیرِ طبع)
شاعر اور شاعری	:	(تنقید)	(زیرِ طبع)

☆ تالیفات

۱. ان سے ملئے	: مضامین مظفر گیلانی	(خاکے)	۱۹۸۸ء
۲. غیاث احمد گدی	: شخصیت اور فن		۱۹۹۹ء
۳. انجم مانپوری	: فنکار سے فن تک		۲۰۰۲ء
۴. عبدالمغنی	: حیات اور خدمات		۲۰۰۵ء
۵. معمار بہار	: شخصیات		(زیرِ طبع)

☆ صحافتی خدمات

(۱) مورچہ، آہنگ، سہیل، عظیم آباد کسپریس، بلٹز، جن ستا، دینک جاگرن وغیرہ میں بحیثیت نمائندہ، مدیر معاون وابستہ رہے۔

(۲) اگست ۱۹۸۴ء سے اردو ہفتہ وار ''بودھ دھرتی'' کے مدیر

(۳) جنوری ۱۹۹۱ء سے اردو سہ ماہی ''ادبی نقوش'' کے مدیر

☆ اعزازات و انعامات

(۱) ۱۹۹۲ء میں مرکزی حکومت کے محکمہ تعلیم ثقافت کی طرف سے فیلوشپ ایوارڈ ملا۔

(۲) ۱۹۹۵ء میں کے کے برلا فاؤنڈیشن، نئی دہلی نے فیلوشپ ایوارڈ دیا۔

(۳) ۱۹۹۶ء میں انگریزی روزنامہ ''ٹائمس آف انڈیا'' نے بہاری آف دی ایئر کا اعزاز بخشا۔

(۴) ۱۹۹۸ء میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنو کے مالی تعاون سے شیریں اختر کی کتاب ''سید احمد قادری: شخصیت اور فن'' شائع ہوئی۔

(۵) بہار، اترپردیش اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے علاوہ دیگر کئی اداروں نے بھی مختلف کتابوں پر انعامات دیئے۔

(۶) کئی قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں شریک ہوئے۔

(۷) آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مختلف چینلوں کے ادبی پروگرام میں شمولیت۔

(۸) مگدھ یونیورسٹی کے سینیٹ کے ممبر نامزد ہوئے۔

ترتیب

بازگشت

کہانی میری....

میرا تیسرا افسانوی مجموعہ ''پانی پر نشاں'' حاضر خدمت ہے۔ اس سے پہلے میرے دو افسانوی مجموعے ''ریزہ ریزہ خواب'' ۱۹۸۵ء اور ''دھوپ کی چادر'' ۱۹۹۵ء میں شائع ہو کر بہار اردو اکاڈمی اتر پردیش اردو اکاڈمی اور دیگر کئی ادبی اداروں سے انعام پا چکے ہیں۔

میرا افسانوی سفر دسمبر ۱۹۷۳ء سے شروع ہوتا ہے جب ماہنامہ ''زیور'' (پٹنہ) میں میرا پہلا افسانہ بہ عنوان ''بوجھ'' شائع ہوا تھا۔ اس طرح تقریباً تین دہائیوں کا میرا افسانوی سفر بہت طویل نہیں، تو مختصر بھی نہیں ہے۔

ان تین دہائیوں میں، میں نے زندگی کے بہت سارے نشیب و فراز، تہذیبوں اور قدروں کا زوال، سماجی رشتوں کا استحصال اور سیاست کی بساط پر انسانیت، حیوانیت کی شہ و مات کی چال کو قریب و دور سے دیکھا اور شدت سے محسوس کیا ہے اور یہی محسوسات میرے افسانوں کے موضوعات بنے ہیں۔

ان موضوعات کو افسانوی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کس قدر بارآور ہوئی ہے، اس کا فیصلہ تو ہمارے ذہین قارئین و ناقدین کو کرنا ہے۔

ویسے میں خود کو اس لحاظ سے خوش نصیب تخلیق کار مانتا ہوں کہ میرے افسانوں پر بڑی تعداد میں ناقدین اور قارئین نے کھل کر باتیں کی ہیں "ریزہ ریزہ خواب" اور "دھوپ کی چادر" سے متعلق مختلف آراء نے یقینی طور پر میرے لئے مشعل راہ کا کام کیا ہے۔ لیکن میں اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا بھی شکار نہیں، مجھے اس امر کا شدت سے احساس ہے کہ میں نے اب تک افسانوی ادب میں ایسا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے جس سے میں خود کو مطمئن کر سکوں۔

حالانکہ بعض قارئین نے میرے کچھ افسانوں کو عالمی معیار کا قرار دیا ہے۔ مثلاً ماہنامہ "شاعر" کے ہم عصر ادب نمبر میں محترمہ انجم آراء انجم (علی گڑھ) نے اپنے ایک مباحثہ بہ عنوان "افسانہ ۱۹۶۰ء کے بعد" میں اپنی رائے دیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے—

"بات معیار کی نہیں، عالمی معیار کی ہے، اس کے علاوہ بات یہ بھی ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کے سارے افسانے میری نظر سے نہیں گزرے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ میری فہرست میں وہ افسانے رہ جائیں، جو عالمی معیار پر پورے اترتے ہوں، بہر حال یہ چند نام حاضر ہیں "ہاؤ سنگ سوسائٹی" (قرۃ العین حیدر) آخری آدمی، شہر افسوس (انتظار حسین) "تیسری ہجرت" (اعجاز راہی) "دریاؤں کی پیاس" "بے محاورہ" (جوگندر پال) 'مرہم' جس تن لاگے" (رتن سنگھ) "رانی" (اقبال متین) 'بیساکھی' دو بھیگے ہوئے لوگ (اقبال مجید) "لمحوں کی بازگشت" (سید احمد قادری) "انجام کار" (سلام بن رزاق) "کابلی والا کی واپسی" (انور قمر) "گھونسلہ" (شوکت حیات)۔

اسی طرح انگریزی روزنامہ "Times of India" کے ۱ ر جنوری ۱۹۹۶ء کے شمارہ میں اس طرح کی رائے دی گئی ہے۔

"A true son of soil, Mr. Quadri is a charles dickens in the making"

اس قسم کی رائے سے میرا حوصلہ بڑھا ہے، بہتر سے بہتر تخلیق کی ترغیب ملی ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ میں لوگوں کی توقعات پر پورا اتروں۔

اس کے لئے میں نے سینکڑوں، ہزاروں ایسی راتیں تخلیقی کرب میں گزاری ہیں، جب لوگ آرام وسکون کی میٹھی نیند کی آغوش میں ہوتے ہیں۔

مجھے تشویش اس بات کی ضرور ہورہی ہے کہ افسانوی ادب کے خلق کے لئے خلوص، احساسات و جذبات اور ایثار، کا جو جذبہ میں نے اپنے ہم عصر اور پیش رو افسانہ نگاروں کے یہاں دیکھا ہے، اس کا نئی نسل میں فقدان ہے۔ زندگی کی بھاگ دوڑ، دولت کمانے کی بڑھتی ہوئی ہوس اور ٹیلی ویژن کے سینکڑوں چینلوں کے بہاؤ میں ابھرنے والے نئے افسانہ نگار معدوم ہوتے جارہے ہیں، جو افسانوی ادب کے لئے فال نیک نہیں، اس رجحان سے افسانہ اور افسانہ نگار، دونوں کا شدت سے نقصان ہونے کا اندیشہ بڑھ گیا ہے، خدا کرے میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہو۔

اس کتاب کی اشاعت میں میرے جن دوستوں اور کرم فرماؤں کا تعاون رہا ہے، میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

❑ سیّد احمد قادری

پرچھائیاں خوابوں کی

جس نے بھی اس سانحہ کی خبر سُنی ، وہ حیرت زدہ رہ گیا، ایسا ہو گیا...... ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا، کاش اس شخص کی اس حالت کا ہمیں اندازہ ہو جاتا، کاش میں یہ جان پاتا کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کر چکا ہے......تو شاید......شاید ایسا نہ ہوتا۔ لیکن حادثہ تو ہو گیا تھا اور اب ہر طرف اس کے چرچے تھے، طرح طرح کے تبصرے تھے۔

ادھر وہ کچھ عرصہ سے اُداس اور پژمردہ ضرور تھا۔ فیکٹری کی لمبی ہڑتال اور اس کے بعد وہاں کی تالہ بندی — نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا — فیکٹری سے ملنے والی تنخواہ ہی اس کے لیئے سب کچھ تھی — ہڑتال اور تالہ بندی کے بعد چند ماہ تو وہ کسی طرح پس انداز کی گئی رقم سے زندگی کی گاڑی کو کھینچتا رہا۔ بیوی اور دو معصوم بچے — بوجھ نہ ہوتے ہوئے بھی فیکٹری کی تالہ بندی کے بعد بوجھ لگنے لگے تھے۔

حالانکہ اس سے قبل زندگی بڑی مزے میں کٹ رہی تھی، فیکٹری سے اتنی تنخواہ مل جاتی تھی، جس سے وہ اپنی خوبصورت اور جوان بیوی اور آٹھ سالہ مسرّت اور دس سال کے سلطان کے پھول جیسے چہروں کی شادابی کو پروان چڑھا رہا تھا۔

ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح اس کے لئے بھی صبح آتی ، بیوی پیار سے اسے

جگاتی اور محبت بھری مسکان کے ساتھ اسے چائے پیش کرتی اور دونوں بچوں کو اسکول جانے کے لئے بستر چھوڑنے کی تاکید کرتی ......دونوں بچے مچی مچی آنکھوں سے جاگتے اور کھسک کر اپنے ابو کے قریب آجاتے اور دائیں بائیں اس سے لپٹ جاتے اور پیار کرتے۔ لیکن اپنی اَمّی کی پیار بھری ڈانٹ جلد ہی انہیں بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیتی اور پھر وہ دونوں جلدی جلدی اسکول جانے کی تیاری میں مشغول ہو جاتے......اس درمیان شرافت حسین صبح کا اخبار پڑھنے میں مشغول ہو جاتا اور اخبار اسی وقت وہ رکھتا جب دونوں بچے بالکل تیار ہو کر سلام کرنے اس کے قریب آتے۔ وہ جلدی سے بستر سے اُٹھ کھڑا ہوتا اور اپنی بیوی کے ہمراہ ان دونوں بچوں کو دروازے تک الوداع اور خدا حافظ کہنے آتا— دونوں بچے آگے بڑھتے جاتے اور مڑ مڑ کر ٹاٹا۔ بائی بائی کرتے جاتے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک کہ ان دونوں کی نگاہوں سے یہ دونوں اوجھل نہ ہو جاتے— اور پھر وہ مڑ کر اپنی بیوی کو پیار اور شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتا اور میدان صاف دیکھ کر، اس کے گداز جسم کو اپنی باہوں میں بھر لیتا، اور بیوی کی پیار بھری مزاحمت سے لطف اندوز ہوتا۔ پھر وہ دونوں اندر کمرے میں آتے۔ کچھ دیر بیٹھ کر گرم گرم چائے کی چسکیوں کے درمیان نرم نرم پیار محبت کی باتیں ہوتیں اور گھڑی جب آٹھ بجنے کا اعلان کرتی تو اس کی بیوی اسے جلد تیار ہونے کی تاکید کرتی اور اسے فیکٹری بھیجنے کی تیاری میں وہ خود لگ جاتی۔ دفتر جاتے وقت اس کی بیوی پیار بھری نگاہوں نے اسے الوداع کہتی اور دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہتی— شام کو جب وہ گھر لوٹتا تو داخلی دروازے پر اس کی بیوی اور بچے، اس کا والہانہ استقبال کرتے۔ اندر کمرے میں پہنچ کر ڈھیر ساری باتیں، چائے، ناشتہ، بچوں کا ہوم ورک، دن بھر کی گزری باتوں کا ذکر، پھر ٹی وی پر خبریں اور سیریئل— اور پھر کھانا کھا کر سب ایک ساتھ خواب کی وادیوں میں کھو جاتے۔

اس طرح ان لوگوں کی زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ چھٹیوں کے دن سب ساتھ رہتے، اچھے کھانے کھاتے، شام کے وقت کالونی میں گھومنے نکل جاتے— پرب تہوار کے دن تو اس کا گھر خوشیوں کی موسیقی سے جھومتا رہتا۔ خاص طور پر عید کے

روز — نئے نئے کپڑے، دودھ، سوئیاں، پلاؤ، مرغ، دوست احباب کی دعوت، بچوں کا دل بھی خوشیوں اور مسرتوں کے جھولے میں جھولتا رہتا، اس کی بیوی کی اپنی دوستوں کے درمیان ہنسی اور کھلکھلاہٹیں...... زندگی سے بھرپور ہوتے تھے، اس کے قہقہے...... لیکن اب اس کی بیوی کے اداس اور پژمردہ چہرے کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے بھی زندگی سے بھرپور قہقہے بکھیرے ہونگے، اس نے بھی خوشیوں کے تار چھیڑے ہونگے، اس کی آنکھوں نے بھی زندگی کی لہروں کو دیکھا ہوگا۔

ہر طرف اداس، اجاڑ، بے جان، بے کیف لمحوں کی حکمرانی تھی۔ ان کے گھر کی ساری خوشیوں، مسرتوں، اسائشوں کو فیکٹری کی تالہ بندی نے نگل لیا تھا — تالہ بندی کے بعد زندگی کو بوجھ بنتے دیکھ کر اس نے کئی جگہ نوکری تلاش کی، لیکن اس زمانے میں نوکری کا ملنا ناداروں اور غریبوں کو خوشیاں ملنے سے زیادہ مشکل ہے۔ اس کی تمام کوشیش ناکام رہیں، اس کے پاس اتنے روپے بھی نہیں تھے کہ وہ چھوٹی موٹی تجارت کر لیتا — اس کی بڑھتی بے کاری اور مفلسی کو دیکھ کر اس کے اپنوں نے بھی اس سے منہ موڑ لیا — بچوں کی فیس کی بڑھتی رقم کی ادائیگی نہ ہونے پر اسکول سے ان دونوں کا نام کاٹ دیا گیا — اس دن وہ اپنے بچوں سے چھپ کر اپنی بے بسی اور بے چارگی پر بہت رویا تھا — فاقہ کشی کی نوبت آنے لگی تو اس نے اپنے گھر کا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا — اور چند ہی ماہ بعد اس کے گھر کے ہر کونے اور در و دیوار سے افلاس جھانکنے لگا — اسی دوران رمضان کا مبارک مہینہ آ گیا — رمضان کا چاند دیکھ کر اسے اطمینان اور مسرت کا احساس ہوا — اس کی بھوک اور پیاس کو ایک پردہ مل گیا۔ پہلے تو وہ اور اس کی بیوی روزے کا خوب خوب احترام اور اہتمام کرتے تھے، لیکن اس ماہ کے روزے کا وہ صرف احترام ہی کر سکتا تھا، اہتمام کے لئے اس کے پاس کچھ تھا کہاں — اس نے اپنے دونوں معصوم بچوں کو بھی روزے کی اہمیت بتا کر روزہ رکھنے پر مجبور کر دیا تھا — افطار کے وقت کبھی لمبا بچھنے والا دسترخوان سمٹ کر بے حد مختصر ہو گیا تھا۔ افطار ہی کھانا بھی ہوتا اور سحری بھی — بچے کبھی پیٹ نہیں بھرنے کی شکایت کرتے، تو وہ بچوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ بیٹے رمضان میں زیادہ کھانا اچھا نہیں، روزہ کی حالت میں

کھٹی ڈکار آجائے تو روزہ مکروہ ہو جاتا ہے—جس کے جواب میں ان بچوں کا یہ کہنا کہ جب پیٹ بھرتا ہی نہیں تو کھٹی ڈکار کا سوال کہاں—اور بچوں کی یہ بات سن کر دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو بے بس نگاہوں سے دیکھتے اور فرط جذبات سے آنکھوں سے اومنڈتے آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے—

دن کے وقت دروازے پر کوئی سائل فطرہ اور زکوٰۃ کا سوال لگاتا تو دونوں کا دل اندر سے چیخ اُٹھتا—تم لوگ ہم سے فطرہ اور زکوٰۃ مانگ رہے ہو؟ اس وقت تو خود ہم لوگ اس کے محتاج ہیں، لیکن سماج نے ایسی شرم وحیا، ضمیر اور عزت ووقار کی ہتھکڑیاں ہاتھوں میں ڈال دی ہیں کہ ہم دست سوال بھی نہیں بڑھا سکتے۔ تم لوگ تو ہم سے بہتر ہو کہ بھیک کی صدا بے جھجک لگا رہے ہو۔

دھیرے دھیرے رمضان کا آخری عشرہ آ گیا—اور اب چند دنوں بعد عید آنے والی ہے۔ شرافت اور اس کی بیوی کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ دونوں کے دلوں میں طرح طرح کے سوالات اُٹھ رہے تھے— کیا ہوگا— کیسے ہوگا— بچوں کو کس طرح سمجھایا جائے—عید کے روز ان کا غمگین اور اداس، بجھا بجھا چہرہ کیسا ہوگا— کیا کہوں انہیں، کیسے سمجھاؤں انہیں کہ......!

شرافت علی ان ہی سوالوں کے اُدھیڑ بن میں کھویا رہتا— قرض کے لئے بھی کئی گھر کے دروازوں پر اس نے دستک دی لیکن ہر دستک کی صدا لوٹ آئی—لوگ دل کھول کر فقیروں، مسکینوں اور محتاجوں کو فطرہ، زکواۃ اور خیرات بانٹ رہے تھے، لیکن قرض کے نام پر ان کے پاس دینے کو کچھ نہ تھا—ہر جگہ کے انکار نے اس کے پورے وجود کو توڑ کر رکھ دیا تھا اور اب تو اس کے سوچنے کی صلاحیت اور کچھ کرنے کی ہمت بھی جواب دینے لگی تھی—غربت، مفلسی اور بے بسی وبے چارگی کے بھنور نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

آخری روزہ بھی آ گیا، شام کے وقت وہ کسی تھکے ہارے پرندہ کی طرح گھر واپس آیا، مغرب کی اذان سن کر دسترخوان پر رکھے گلاس کے پانی سے روزہ کھولا، افطار کے

نام پر پڑی چند روٹیوں کو اس نے بیوی اور بچوں کی جانب کھسکا دیا۔ دونوں بچوں اور اس کی بیوی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے کھانے لگے — ان لوگوں نے اس سے سوال کرنا بند کر دیا تھا۔ اس لئے کہ ہر سوال کا جواب خود ایک سوال بن جاتا۔ پھر ایسے سوال کرنے کا کیا حاصل۔ بیوی اور بچے، اس کے دلوں کے اندر کے زخم کی اُٹھتی ٹیس اور درد کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔

اچانک باہر کی گلی میں پٹاخے چھوٹنے لگے...... اور شور بلند ہوا...... چاند ہو گیا...... چاند ہو گیا!!

شرافت خاموشی سے اُٹھا، اپنے آپ سے سوال کیا — چاند ہو گیا، اس کا مطلب کل عید ہے، عید یعنی خوشی کا دن، لیکن اس کے لئے یہ عید — کیا واقعی خوشی اور مسرت کی پیامبر ہو گئی — کل میرے بچے سبھوں کے سامنے غربت اور افلاس کی مجسم تصویر بنینگے، بیوی میری بے چارگی اور بے بسی کی مورت بنے گی اور لوگ دیکھیں گے کہ......!

وہ گھر کے باہر کے برآمدے میں بیٹھا، سوچنے لگا، اس کی سوچ اور فکر کا دائرہ پھیلتا گیا، اس کی نظروں کے سامنے پٹاخے چھوٹ رہے تھے، لیکن اس کے کان اس کی تیز آواز سننے سے قاصر تھے، اس کا پورا وجود سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا — اچانک وہ کھڑا ہو گیا، اس کی سوچ اور فکر کا دائرہ سمٹ گیا، اسے سارے مسئلے کا حل نظر آ گیا — کل بچے نئے کپڑوں کا سوال کریں گے، نہ اس کی بیوی کے جسم سے مفلسی جھانکے گی اور نہ ہی —

وہ تیز قدموں سے باہر نکلا اس کے ہاتھ میں گھر کا ایک سامان تھا، اسے اس نے فروخت کیا اور تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ڈیری فارم کے دودھ کا ایک پیکٹ تھا اور پینٹ کی جیب میں ایک پڑیا۔

آس پڑوس کے گھروں سے عید کی تیاریوں کا شور اُٹھ رہا تھا لیکن اس کے گھر کے اندر تاریکی، اداسی اور سناٹے کی حکمرانی تھی، بیوی، بچے مجسم سوال بنے تھے، ان کے دلوں میں بھی طرح طرح کے سوالات ڈوب ابھر رہے تھے، لیکن زبان پر بے چارگی کے قفل پڑے تھے۔ وہ گھر کے اندر داخل ہوا تو اس نے اپنے چہرے پر زبردستی کی بے جان

مسکراہٹ دوڑائی، اس کی زراسی مسکراہٹ دیکھ کر دونوں بچوں کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی کا چہرہ بھی کھل اُٹھا، انہوں نے ہاتھ میں دودھ کا پیکٹ دیکھا، تو ان لوگوں نے سمجھا کہ شاید عید کے لئے ہے۔ لیکن شرافت علی نے اس پیکٹ کو اسی وقت کھولا، دودھ کو گرم کروایا اور چار گلاس میں ڈال کر چینی کے ساتھ اپنے پینٹ کے پاکٹ سے پڑیا نکال کر، تینوں کی نظریں بچا کر، اس کا سفوف گھول دیا اور پینے سے قبل اس نے تینوں کو خوب پیار کیا، دونوں بچوں کو سینے سے لگایا، بیوی کے سر پر محبت بھرا ہاتھ پھیرا۔ اس کی اس حرکت سے ان تینوں نے یہی سمجھا کہ کہیں سے قرض مل گیا ہے اور وہ فوری طور پر اپنے دکھ اور پریشانی کو بھول کر خوشیاں بانٹ رہا ہے۔ چند لمحوں بعد چاروں نے ایک ساتھ دودھ کا گلاس اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا لیا بھوک سے پیٹ کا جہنم سلگ رہا تھا' اس لئے دودھ پینے میں سبھوں نے جلدی کی......اور تھوڑی ہی دیر بعد چاروں کو نیند آنے لگی، گہری بہت گہری نیند......اور وہ چاروں ایک ساتھ سو گئے......کبھی نہ جاگنے کے لئے!!!

شعلوں میں گھرا خواب

رشمی نے بھی اپنی پلکوں پر خواب سجائے تھے۔ رنگ برنگے خوشنما خواب......
ایک خوبصورت، اسمارٹ اور دولت مند شوہر سجا سجایا، بنگلہ اور بنگلہ میں کار اور نوکر چاکر کی بھیڑ۔

رشمی نے آنکھیں کھولیں تو اس کے سامنے شہر کی رنگینیاں تھیں، وہ اکثر اپنے کالج کی دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں میں چائے، کافی اور سافٹ ڈرنک کے لئے جاتی اور کبھی اس کے ماں باپ اجازت دے دیتے تو وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ فلم بھی دیکھنے چلی جاتی......
پاپا کی اکلوتی بیٹی تھی! اس لئے اسے پاپا نے ہر طرح کی چھوٹ دے دی تھی اور صرف ایک بات کی تاکید کی تھی کہ بیٹی اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہاری وجہ کر میری عزت پر داغ نہ لگے اور رشمی نے اپنے پاپا کی اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا۔

بظاہر رشمی ایک آزاد خیال لڑکی تھی، لیکن کیریکٹر کے معاملے میں وہ کافی سخت تھی......کالج کے زمانے میں کئی لڑکوں نے اسے رجھانے کی کوشش کی اور اس کے قریب آنا چاہا، لیکن اس نے ہمیشہ اس کا جواب بڑی بے رُخی اور سختی سے دیا جس کی وجہ کر وہ لڑکوں میں مغرور لڑکی کے نام سے مشہور ہوگئی۔

رشمی کے پاپا شہر میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔اس لئے کار،نوکر چاکر اور دولت کی کوئی کمی نہیں رہی...... جب کبھی وہ کسی چیز کی فرمائش کرتی......اس کے پاپا،اسے فوراً پورا کردیتے۔

اکثر وہ اپنی دوستوں کے درمیان موضوع بحث رہتی......اس کا حسن......اس کے قیمتی اور خوبصورت کپڑے......اور اُس کا محبت بھرا سلوک......اس کی دوستوں کا خیال تھا کہ وہ جس گھر میں جائے گی،وہ گھر جنت کا نمونہ بن جائے گا اور اس کا شوہر تو اسے ہر لمحہ ہر پل اپنی آنکھوں میں بسائے رکھے گا۔

لیکن کاتب تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا——ایک دن اچانک اس کے پاپا دفتر سے گھر آئے تو اپنے سینہ میں درد لے کر آئے،درد بڑھتا گیا اور آدھی رات کو زبردست دل کا دورہ پڑا۔ڈاکٹر بلائے گئے،انہیں ہسپتال لے جایا گیا،لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے اور وہ اپنی بیٹی اور بیوی کو روتا سسکتا چھوڑ گئے۔

یہ ایسا غم کا پہاڑ تھا،جس کے نیچے دب کر دونوں ماں بیٹی اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھر گئیں......سارے خواب......سارے ارمان چکنا چور ہو گئے۔

لیکن وقت جو زخموں کا مرہم ہوتا ہے......دبے پاؤں گزرتا رہا اور آہستہ آہستہ دونوں ماں بیٹی نے اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کیں اور ان ہی کوششوں میں رشمی کی ماں کو خیال ہوا کہ رشمی کی اب شادی ہو جانی چاہئے۔وقت اپنی چال سے کافی دور نکل گیا تھا۔

شادی کے لئے رشمی کی ماں نے نظریں دوڑائیں تو انہیں اندازہ ہوا کہ اس کے معیار کے مطابق شادی میں جو مطالبے ہیں،انہیں پورا کرنے میں وہ بالکل بے بس ہے......ہار کر اس نے اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں،جو گاؤں میں کھاتے پیتے لوگ تھے اور لڑکا بھی گاؤں کے قریب کی ایک فیکٹری میں ملازم تھا،وہاں رشمی کا رشتہ طئے کردیا......!

رشمی نے وقت اور حالات کے آگے سپر ڈال دی اور دل ودماغ پر بھاری بوجھ اور آنکھوں میں غم کے تیرتے آنسوؤں کے ساتھ سسرال چلی گئی۔

سسرال اور شوہر دونوں اس کے خواب کے برعکس نکلے——اور سہاگ رات کی

پھولوں کی سیج تو اس وقت کانٹوں میں بدل گئی، جب اس کا شوہر — جو نہ جوان تھا اور نہ خوبصورت بلکہ ناٹے قد کا سیاہی مائل سپاٹ چہرہ، جس پر ایک عجیب سی الجھن اور وحشت طاری تھا......امنڈتی ندی کی پرواہ کئے بغیر دور کھڑا تماشائی بنا رہا۔

دھیرے دھیرے یہ عقدہ کھلا کہ اس کا شوہر اس کے خوابوں کے گلشن میں پھول کھلانے میں ناکام ہے — اس دن رشمی بہت روئی۔ کیا میرا انتظار — میری پاک دامنی کا یہی ثمرہ ہے — رشمی کے چہرے کی اداسیاں اور پژمردگی اور بڑھ گئیں اور وہ ہر لمحہ ہر پل بجھی بجھی سی رہنے لگی!

ادھر گاؤں میں رشمی کی خوبصورتی، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تیرتے شباب کے قصے عام ہو گئے......گاؤں کے کئی نوجوان اس کی ایک جھلک دیکھ لینے کے لئے اس کے گھر کے گرد چکر لگاتے رہتے۔

اور ایک صبح — پورے گاؤں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ رات کی تاریکی میں گھر کے اندر داخل ہو کر کسی نے رشمی کا اغوا کر لیا ہے۔

گاؤں کے لوگوں نے اس حرکت کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا، پورا گاؤں اس حرکت پر چراغ پا ہو گیا — یہ کس کی حرکت ہے۔ گاؤں میں بھالے، گنڈاسے اور بندوقیں نکل گئیں کہ گاؤں کی یہ عزت اور وقار کا سوال تھا۔ پولیس نے معاملہ کی سنگینی دیکھی تو وہ بھی حرکت میں آ گئی اور شام تک ایک مخبر کی اطلاع پر پولیس نے ایک گھر پر چھاپہ مارا — اور وہاں سے رشمی اور ایک خوبصورت نوجوان کو برآمد کر لیا۔

گاؤں والے اس نوجوان پر مشتعل ہو رہے تھے لیکن پولس نے اسے اپنی حفاظت میں لے کر جیل پہنچا دیا۔

رشمی اپنی سسرال واپس آ گئی — اس کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں — اس کی نظروں کے سامنے اسے اغوا کرنے والا گورا چٹا، لمبے قد کا اسمارٹ نوجوان گھوم رہا تھا، جس نے اس پر کوئی جبر و ظلم نہیں کیا، بلکہ اسے ہر لمحہ اپنی محبت کا یقین دلاتا رہا — اور اس رات جب پولس نے چھاپا مارا وہ امنڈتی ندی کی طرح کنارہ تلاش کر رہی تھی اور اسے اغوا کرنے والا اس کے سامنے چٹان سا بنا اسے اپنی بانہوں میں لینے کو بے تاب تھا کہ

اچانک پولیس کے بوٹوں کی آواز گونجنے لگی تھی اور ایک بار پھر وہ کسی تھکے ہارے پرندہ کی طرح پولس کی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی!

اپنے کمرے کے بستر پر اس کی سسکیاں بڑھتی گئیں کہ اچانک اس کی پشت پر کسی نے ہاتھ رکھا وہ چونک کر مڑی تو اس نے دیکھا سامنے اس کا بے جان سا شوہرا سے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

رشمی کے ذہن میں خیالات کی آندھیاں پھر چلنے لگیں اور گزرے ہوئے خاص لمحوں کی ایک ایک تصویر اس کی نظروں کے سامنے آنے لگیں اور اس نے سوچا— کاش پولیس کو آنے میں کچھ دیر ہو جاتی!

☆☆☆☆☆☆

مسیحا کی مسیحائی

اور پھر...... میں بھی درباریوں میں شامل ہو گیا۔ کسی نے میرے کانوں میں یہ منتر پھونک دیا تھا کہ زندگی بھر قلم گھسیٹتے رہو گے، لیکن کچھ نہیں ملنے والا۔ شہرت اور مقبولیت کی کرنوں سے غربت اور افلاس کی تاریکی دور نہیں ہوتی۔

بادشاہ سلامت کو بھی میری شمولیت سے خوشی ہوئی، کہ قصیدہ خوانوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔ بادشاہ سلامت نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور کہا اگر منصب چاہتے ہو تو جاؤ سب سے پہلے اپنی ان تحریروں کو جن سے بغاوت کی چنگاریاں پھوٹ رہی ہیں، انہیں خاکستر کر دو، کہ کہیں کسی دن میرے لئے تمہاری یہ تحریریں دشواریوں کا باعث نہ بن جائیں۔ اس لئے کہ تمہاری یہ تحریریں مفلسوں، غریبوں اور دبے کچلے انسانوں کی داستان سناتی ہیں اور ایسی داستانیں کبھی بھی موافق ہوا کے رُخ کو موڑ سکتی ہیں...... میں نے بادشاہ سلامت کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اپنی ان تحریریوں کو جنہیں کبھی میں نے اپنا خون جلا کر اور ہزاروں راتوں کی نیندیں حرام کر شدادوں اور نمرودوں کے خلاف لکھی تھیں اور عدل وانصاف کے لئے کسی انقلاب کی آمد کو ضروری بتایا تھا۔ انہیں جلا کر خاک کر دیا، میری بیوی اور بچے اس عمل سے مجھے دور رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل تھا، غریبوں، مزدوروں اور مفلسوں کی کہانی لکھتے لکھتے میں خود مفلس ہو گیا تھا...... اپنی موتیوں جیسی چمکتی تحریروں کی

جلی راکھ کو مٹھی میں دبائے میں بادشاہ سلامت کے دربار میں پیش ہوا اوران کے سامنے اپنی مٹھی کھول دی...... بادشاہ سلامت یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فتح یابی کی مسکراہٹ کے ساتھ میری پیٹھ تھپ تھپائی، جیسے میں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو......خوشی میں انہوں نے ڈھیر سارے انعام واکرام سے نوازا۔ ان انعامات کی چمک دمک نے میری سوچ اور فکر پر پہرے بیٹھا دیئے۔

میری اس کامیابی سے جہاں ایک طرف کچھ لوگ خوش ہوئے وہیں زیادہ تر لوگوں نے ناک بھوں چڑھائے اور مجھے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا......لیکن مجھے ان کی تنقیدوں کی اب پرواہ کیا تھی ......عیش وآرام کی زندگی جب میسر آجائے تو پھر لوگوں کی تنقید پر کون توجہ دیتا ہے۔ میں نے ان تنقید کرنے والوں کو حاسد کہہ کر خود کو مطمئین کرنے کی کوشش کی اور اپنی نئی دنیا میں گم ہو گیا۔

ایک دن بادشاہ سلامت نے دربار خاص میں مجھے اپنے قریب بلایا اور کہا......تم دیکھ رہے ہو میرے خلاف کیسی کیسی سازشیں رچی جارہی ہیں۔ میری مسیحائی کو چیلنج کیا جارہا ہے۔ میرے کارناموں پر خاک ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے، میرے خلاف نعروں کا شور بڑھتا جارہا ہے۔ جب کہ میں ان کا ہمدرد اور غم گسار ہوں......اور......اور......تم تو قلم والے ہو، تمہاری تحریروں میں بڑی جان ہے، جو ہوا کے رخ کو پلٹ سکتی ہے۔ پھر کیوں نہیں تم......جاؤ تم اپنا وہ پرانا قلم لے آؤ......پھر میں تمہیں سمجھاتا ہوں......اور جب میں بے کار محض پڑے اس زنگ آلود قلم کو لے کر بادشاہ وقت کے حضور میں پیش ہوا تو انہوں نے ایک تمسخر کے ساتھ وہ قلم میرے ہاتھوں سے لے لیا، چند لمحوں تک وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اور پھر اسے قریب کے آتش داں میں ڈال دیا...... یہ دیکھ کر میرے بدن میں ایک جھرجھری سے آئی اور سرد موسم کے باوجود نہ جانے کیوں میرے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں......ایک اچٹتی سی نگاہ بادشاہ وقت نے مجھ پر ڈالی اور پھر اپنے ایک ملازم کو کچھ اشارہ کیا......اشارہ پا کر وہ ملازم غائب ہو گیا اور چند لمحوں بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں پر خوبصورت چاندی کا تشت تھا، جس پر ایک قلم رکھا ہوا تھا...... بادشاہ سلامت نے وہ قلم اٹھایا اور میرے ہاتھوں میں دے دیا۔

یہ قلم دیکھ کر میں حیرت میں پڑ گیا۔ یہ قلم...... یہ تو کافی قیمتی ہے، سونے اور

ہیرے کی چمک سے وہ قلم جگمگ جگمگ کر رہا تھا...... بادشاہ وقت نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر یوں گویا ہوئے......

''یہ قلم تمہارے لئے ہے، اس سے تم میری کہانی لکھو، میری تاریخ بیان کرو، میرے سنہری دور کی تاریخ......اور لوگوں کو بتاؤ کہ میں ایک مسیحا ہوں، مہاتما ہوں، جسے ہمیشہ مفلسوں، مظلوموں، پسماندوں اور محتاجوں کی فکر ستاتی رہتی ہے۔ رعایا کی فلاح و بہبود اور سلطنت کی ترقی و خوشحالی کے لئے میں بے چین اور بے قرار رہتا ہوں۔ اتحاد و اتفاق کو بنائے رکھنے کے لئے میں ہمیشہ کوشاں رہتا ہوں اور......اور......''!

بادشاہ سلامت اپنے کارناموں اور صفات پر روشنی ڈال رہے تھے اور میرا ذہن جانے انجانے خوف اور سوچ و فکر کے تلاطم میں ڈوب ابھر رہا تھا۔

سونے کا قلم لئے میں گھر واپس آیا اور اطمینان سے بیٹھ کر بادشاہ سلامت کے کارناموں کو سنہری حروف میں لکھنے لگا، جو آگے چل کر کبھی تاریخ کا حصہ بن جائینگے اور آنے والے کل کو جب یہ تاریخ پڑھی جائے گی تو لوگ یاد کریں گے کہ ایسا بھی کوئی بادشاہ اس دور میں گزرا ہے جو عدل و انصاف کا مجسمہ تھا۔ ظلم و تشدد، استحال اور افلاس کا دشمن تھا۔ ایک ایسا بادشاہ جس نے غریبی اور مفلسی کی اندھیری گلیوں میں آنکھیں کھولیں اور معصوم عوام نے اسے اپنے دکھ درد، دور کرنے، اندھیرے کے خاتمہ کے لئے اور ظلم و بربریت کے خلاف محاذ آرائی کے لئے اس کے وعدوں اور دعوں پر بھروسہ کرتے ہوئے بادشاہت سونپ دی۔ جس دن وہ عام آدمی بادشاہ بنا، اس دن عوام نے خوشیوں کے چراغ جلائے کہ اب ان لوگوں کا نجات دہندہ مل گیا ہے۔ اب ان لوگوں کا مقدر بدلنے والا مسیحا مل گیا ہے۔ سبھوں کو اس کی مسیحائی پر یقین تھا اور......اور...................''! اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میرا قلم رک گیا۔ میں نے قلم کو ٹیبل پر رکھ دیا کہ شاید چلتے چلتے سنہری حروف اگلتے اگلتے تھک گیا ہے۔ شاید میں بھی تھک گیا ہوں۔ کچھ دیر آرام کرلوں۔ پھر......لکھنا شروع کروں گا۔

مجھے آرام کے موڈ میں دیکھ کر میری بیوی میرے قریب آئی، بڑے پیار سے اس نے چائے پیش کی اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو اس کے اندر بیٹھا میرا خوف دور ہوتا نظر آیا اور اس نے ہمت جٹا کر اپنی بات شروع کی۔

''آپ دربار کی چکا چوندھ میں ایسے ڈوبے ہیں اور بادشاہ وقت کی تاریخ لکھنے

میں اس قدر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں کہ آپ باہر کی دنیا نہیں دیکھ پا رہے ہیں کہ باہر کیا ہو رہا ہے لوگ ڈرے سہمے اور سراسیمہ ہیں اور بادشاہ وقت کی شہہ پر ظلم و بربریت کا ننگا ناچ ہو رہا ہے۔ امن و آشتی کے دعوے اور وعدے کھوکھلے اور بے معنی ثابت ہو رہے ہیں۔ یکجہتی اور اتحاد کی نام نہاد کوششوں سے لوگ خوف زدہ ہیں کہ فساد جب کبھی برپا ہوتا تھا تو انہیں موت ایک دن اور ایک لمحہ ملتی تھی، لیکن اب تو انہیں قسطوں میں مرنا پڑ رہا ہے۔ کبھی ظلم و بربریت کے خنجر سے، کبھی بھوک کی جلتی آگ سے، کبھی عصمت اور عزت کے لٹنے کی شرمساری سے اور کبھی...... یہ آپ کے مسیحا کی کیسی مسیحائی ہے' اس سے تو بہتر تھا کہ......

''خاموش...... بہت ہو گیا...... تم جھوٹ پر جھوٹ بولتی جا رہی ہو'' میں تقریباً چیخ پڑا اور غصہ سے بے قابو ہو کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گالوں پر رسید کر دیا۔

اچانک میرا تھپڑ کھا کر وہ سہم جانے کی بجائے الف ہوئی اور غصہ سے اس کا چہرہ آگ بگولہ ہو گیا اور وہ کسی بھوکی شیرنی کی طرح گرجنے لگی۔

''مجھے تھپڑ مار کر خاموش کر دینا چاہتے ہیں، لیکن ذرا انہیں تھپڑ مار کر تو دیکھئے جو ظلم وستم کے خلاف تیشہ اٹھا چکے ہیں۔ بادشاہ وقت نے آپ کی آنکھوں پر سونے چاندی کے منصب و اعزاز و اکرام کی پٹی باندھ دی ہے، پھر آپ کو دنیا کی حقیقت کیسے نظر آئے گی؟ جائیے اس پٹی کو اتار کر باہر دیکھئے...... لوگوں کے صبر وضبط کا باندھ ٹوٹ چکا ہے اور اس کے تیز بہاؤ میں آپ اور آپ کے بادشاہ سلامت خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔ کوئی آگے بڑھ کر بچا نہیں پائے گا، بلکہ لوگ تماشہ دیکھیں گے۔ اس سے قبل کہ بہت دیر ہو جائے اور سارے کے سارے راستے مسدود ہو جائیں۔ آپ جاگ جائیے، برسوں سے سوتے سوتے لوگ جاگ سکتے ہیں تو پھر آپ کیوں سوئے ہوئے ہیں؟ آپ تو خود دوسروں کو جگانے کا کام کیا کرتے تھے۔ پھر آپ کی یہ کیسی بیداری ہے کہ آپ جاگتے ہوئے بھی سو رہے ہیں۔ پھینک دیجئے۔ سونے اور ہیرے کا قلم اور لائیے وہ اپنا قلم! جس سے آپ انقلاب لانا چاہتے تھے''۔

بدلتے موسم کے مزاج کا اندازہ تو مجھے تھا۔ لیکن میں حقیقت سے آنکھیں چُراتا رہا۔ آج بیوی کی ان باتوں کو سن کر میں لڑکھڑا گیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میری سوچ اور فکر پر بادشاہ وقت نے پہرے بیٹھا دیئے ہیں اور وہ قلم کب کا حرص و طمع کی ایندھن میں جل چکا ہے۔

میں گھبرا کر باہر نکل آیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا بادشاہ وقت کے حضور میں پیش ہوا اور سہمے ہوئے لہجہ میں خوف سے کانپتے ہوئے تمام باتیں گوش گزار کرنے کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ایسا لگتا ہے کہ طوفان بہت قریب آچکا ہے اور............

یہ سب سن کر بادشاہ سلامت مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا...... کافی فاصلہ طئے کرنے کے بعد پائیں باغ سے نکل کر ایک جگہ بادشاہ سلامت کھڑا ہو گیا اور مجھے ایک جانب اشارہ کیا...... دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے...... مجھے اس طوفان کی آمد آمد کا اندازہ ہے۔ اسی لئے میں یہ وشال کشتی بنوا رہا ہوں، تاکہ جب کبھی طوفان ہمارے سروں کو چھونے کے قریب ہو جائے تب ہم سب اس کشتی میں سوار ہو جائیں گے اور سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے بحفاظت دور بہت دور نکل جائیں گے۔ اس لئے تم گھبراؤ نہیں اور اپنا کام جاری رکھو۔ سنہری حروف میں میری تاریخ لکھو کہ یہی تاریخ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید بنادے گی۔

بادشاہ سلامت کی باتیں سن کر میں پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ واپس گھر آیا کہ اب مجھ پر کوئی خطرہ نہیں منڈرا رہا ہے۔ میں پوری طرح بادشاہ وقت کے ساتھ محفوظ ہوں۔ گھر میں داخل ہو کر اپنے ٹیبل کے قریب جا پہنچا کہ بادشاہ وقت کی ادھوری تاریخ کو مکمل کروں کہ اچانک مجھے یہ دیکھ کر جھٹکا لگا کہ میری لکھی ہوئی تاریخ کے سارے حروف پر کسی نے کالی سیاہی انڈیل دی تھی اور سونے کے قلم اور لکھنے کے کاغذ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں گھبرا کر اپنی بیوی کی جانب مڑا تو دیکھا وہ دور کھڑی مسکرا رہی تھی اور اس کے چہرے پر فتح کی طمانیت تھی اور باہر دروازے پر بھیانک تیز طوفان اپنی آمد کی دستک دے رہا تھا۔ میں سہم گیا یہ طوفان...... کہیں یہ طوفان...... طوفان نوح نہ ثابت ہو۔ اچانک مجھے بادشاہ وقت کی دور سمندر پار اتر جانے والی کشتی یاد آئی۔ لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس طوفان سے کشتی پر سوار ہونے والے لوگ بچ پائیں گے یا پھر اس طوفان کے لانے والے۔ میرے سامنے سوالوں کا لامتناہی سلسلہ تھا اور میں طوفان کی زد پر تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

خوشبو گلابوں کی

میں اس شہر میں دو دن قبل آیا ہوں۔ آج دفتر کا کام ختم کر کے شام منانے اپنے دوست پریم کمار کے ساتھ شہر کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

لیکن ہر طرف شور، ہر جانب لوگوں کا اژدہام...... نہ جانے کیوں بھیڑ اور شور سے میری طبیعت گھبرانے لگی......اس بات کا جب میں نے پریم سے ذکر کیا تو اس نے فوراً راستہ بدل دیا اور ہم لوگ ایک بھیڑ سے خالی سڑک پر آ گئے۔ بھیڑ اور شور کم ہوا تو ہم دونوں باتیں بھی کرنے لگے، ورنہ بھیڑ اور شور میں، وہ کیا کہہ رہا ہے اور میں کیا سن رہا ہوں سب گڈ مڈ ہو رہا تھا۔

چلتے چلتے اچانک میری نظر ایک قدیم عمارت پر پڑی، میں اسے غور سے دیکھنے لگا، تو پریم نے اس کی مختصر تاریخ بیان کر کے نہ صرف میرے تجسس کو جگا دیا بلکہ اپنے تاریخ کے گہرے مطالعہ کا بھی ثبوت فراہم کیا۔ دراصل پریم دور مغلیہ کے انحطاط پر کوئی کتاب لکھ رہا تھا۔ اس لیے اسے اس دور کی باتوں میں بڑی دلچسپی تھی۔

پریم کو اس سلسلے میں میرے تجسس اور دلچسپی کا اندازہ ہوا، تو اسے غالباً اندر ہی اندر بڑی خوشی ہوئی اور مجھے مزید ایسی کچھ خاص چیزوں کو دکھانے کے لئے وہ ایک دوسرے راستے پر مڑ گیا۔

کچھ فاصلے طئے کرنے کے بعد ہم دونوں ایک میدان کے قریب کھڑے تھے جو دور سے ایک قبرستان جیسا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا......اور اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ قبرستان ہے، لیکن دوسرے سینکڑوں، ہزاروں قبرستانوں سے مختلف......''!

مختلف؟ مطلب......وہ کیسے؟

وہ ایسے کہ یہاں جو لوگ آرام فرما ہیں، ان میں ہر طبقہ اور ہر مذہب کے لوگ ہیں۔ اس لئے تم اس قبرستان کو یکجہتی کا بہترین نمونہ کہہ سکتے ہو۔

''لیکن......یہ......یہ کیسے ممکن ہے؟

''تمہاری یہ حیرت درست ہے، آؤ ادھر دیکھو''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر قبرستان کے اندر داخل ہو گیا اور ایک چوکور سے چبوترے کے قریب کھڑا ہو گیا ''اسے دیکھو............یہ بھی ایک قبر ہے''

''یہ......قبر ہے؟ ایسی قبر؟ میں چونک پڑا

''ہاں یہ دیکھو اس پر کتبہ لگا ہوا ہے'' اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی بتائی جگہ پر جا کر قریب سے دیکھا، تو واقعی وہاں پر کتبہ نصب تھا۔ میری نظریں کئی قبروں پر لگے کتبہ کو دیکھنے لگیں......اور میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ مختلف قبریں مختلف نام......مختلف فرقہ......اور مختلف مذہب کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

میری حیرت اور استعجاب بھری نظروں کو دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ میرے ذہن میں کیسے کیسے سوالات ڈوب ابھر رہے ہیں۔

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور میرا ایک ہاتھ پکڑ کر قبرستان سے باہر آ گیا۔

''چلو بتاتا ہوں اس قبرستان کی کہانی جو یقینی طور پر ایک تاریخی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ لیکن افسوس کہ لوگ اس کی تاریخی حیثیت کو بدلتے جا رہے ہیں......ایک وقت تھا، جب اس جگہ کچھ لوگ فاتحہ پڑھنے آتے تھے تو کچھ لوگ عقیدت کے پھول چڑھانے، لیکن وقت کی تیز آندھی نے اس کی تاریخی اہمیت کو ختم کر دیا اور..............''

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا، لیکن نہ جانے کیوں خاموش ہو گیا اور سر جھکائے چلتا رہا۔

اس وقت اسکی خاموشی مجھے گراں گزر رہی تھی، اور میں نے پوچھ ہی لیا۔

''ہاں تو تم کہہ رہے تھے............

پریم نے ایک اچٹتی نگاہ میرے چہرہ پر ڈالی اور تیز قدم بڑھاتا ہوا، ایک ریستوران میں داخل ہوگیا اور بالکل کنارے کے ایک ٹیبل کے گرد رکھی کرسیوں میں ایک پر بیٹھ گیا اور دوسری کرسی پر مجھے، بیٹھ جانے کا اشارہ کیا...... ویٹر کو چائے کا آڈر دے کر اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور کش پر کش لینے لگا اور میں محو استعجاب بنا اسے دیکھتا رہا...... شاید وہ سوچ رہا تھا، تاریخ کے اس واقعہ کو کہاں سے شروع کیا جائے۔

کچھ وقفہ کے بعد چائے آگئی، پریم نے چائے کی دو چسکی لی اور سر اٹھا کر میری جانب دیکھتے ہوئے وہ شروع ہوگیا۔ غالبًا اتنی دیر میں اسے واقعہ کا کوئی سرا ہاتھ آ گیا تھا۔

ہاں تو، تم جانتے ہو کہ انگریزوں نے کمزور پڑتے جا رہے مغلوں پر پوری طرح تسلط پالیا تو مغل خاندان کے لوگوں کو چن چن کر گرفتار اور قتل کرنا شروع کر دیا تھا اور عا[illegible] تھا کہ لوگ انگریزوں کے ظلم وستم اور خوف و دہشت سے محل چھوڑ کر بھاگنے والوں [illegible] دینے کے لئے بھی رضامند نہیں تھے۔ مغل خاندان کے افراد در در اپنی جان کی امان اور پناہ کے لئے بھٹکتے پھرتے، دستک دیتے رہتے، لیکن انہیں ہر دستک کا جواب خاموشی یا نفی میں ملتا۔ ایسے ہی حالات سے دوچار مغل خاندان کے ایک نوجوان کا جب موت تعاقب کر رہی تھی، تو وہ کسی تھکے ہارے پرندہ کی طرح پناہ کے لئے شہر کے مختلف دروازوں پر دستک دے رہا تھا اور ہر دستک کی گونج خوف و دہشت بھری بھیانک خاموشی میں ڈوب جاتی۔

اس شہر میں ایک شخص مولانا حامد علی تھے جنہوں نے انگریزوں کے ظلم واستبداد کی پرواہ نہ کی اور اس مغل نوجوان کے لئے پناہ کا دروازہ کھول دیا۔

دیکھنے والوں نے دیکھا اور خوف سے کانپ گئے کہ اس مغل نوجوان کے ساتھ ساتھ اس مولانا کا بھی بُرا حشر ہونے والا ہے اور وہی ہوا...... جاسوسوں کے ذریعہ انگریز سپاہیوں کو خبر مل گئی۔ اور شب کے پہلے ہی پہر، مولانا کے دروازے پر کئی فوجیوں نے ایک ساتھ دستک دی، جس کے جواب میں مولانا اور انکے گھر میں پناہ گزیں مغل نوجوان دونوں ایک ساتھ دروازے سے باہر نکل آئے اور انگریز سپاہیوں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بندوقوں کے سائے میں آگے بڑھنے لگے۔ کچھ انگریز سپاہی ان دونوں کو لے کر آگے بڑھنے لگے اور کچھ مولانا کے گھر کے پاس رک گئے...... اور مغل نوجوان کو پناہ دینے کی جرات

کرنے کے جرم میں، مولانا کے گھر کو آگ لگادی گئی۔ ان کا گھر دھڑ ادھڑ جلنے لگا اور گھر کے اندر سے انسانی چیخوں کی بازگشت آسمان چھونے لگی...... کچھ لوگ، کسی طرح چیختے چلاتے باہر نکلے اور کسی طرح اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔ ان خوش نصیب لوگوں میں مولانا کی بیگم بھی تھیں۔ وہ بھاگتی ہوئی کسی طرح اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں پہنچیں، پناہ تو انہیں مل گئی، لیکن پناہ دینے والوں کے چہرے پر موت کے سائے منڈرانے لگے...... کہ نہ جانے کس لمحہ پناہ دینے کے بدلے بے پناہی کا پیغام آجائے۔

وہ رات قیامت کی رات تھی، خوفناک اندھیرے میں خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی بندوق کی گرج اور انسانی چیخوں کی دلخراش بازگشت نے پوری فضا کو ہیبتناک بنا دیا تھا۔ مولانا کی بیگم کو یقین تھا کہ ان ابھرنے والی چیخوں میں ایک چیخ ضرور ان کے شوہر کی بھی ہوگی...... اس فکر کے باوجود اس بہادر خاتون نے صبر وتحمل کی چادر کو اپنے پورے جسم پر لپیٹے رکھا۔

رات کی خوفناک تاریکی پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک باہری دروازے پر سرگوشی ہوئی، سرگوشی سن کر گھر کے اندر کے سارے لوگ سہم گئے، شاید اب انہیں ...... لیکن سرگوشی میں ایک آواز جانی پہچانی تھی...... ہمت کر کے اندر سے کسی نے پوچھا' کون؟

جواب میں باہر سے کسی نے کہا...... میں ہوں لالہ ہری داس"

لالہ ہری داس کی آواز سن کر گھر کے سبھی لوگوں کے دل کا خوف غائب ہو گیا اور کسی حد تک اطمینان کی سانس لیتے ہوئے دروازہ کھول دیا گیا، اس لئے کہ لوگ جانتے تھے کہ لالہ ہری داس اور مولانا حامد علی گہرے دوستوں میں ہیں۔

لالہ ہری داس گھر کے اندر داخل ہوئے اور مولانا کی بیگم کے بارے میں سن کر کہ وہ یہیں پناہ گزیں ہیں، اطمینان کی سانس لی اور بیگم صاحبہ سے کہا...... چلئے میرے ساتھ...... میدان میں کئی لاشیں پڑی ہیں، ان میں سے مولانا کی لاش کو احترام کے ساتھ دفن کر دیا جائے ورنہ صبح کے بعد انگریز نہ جانے ان کا کیا حشر کریں گے۔

لالہ ہری داس کی بات سن کر بیگم نے ایک دلدوز چیخ ماری اور ان کی آنکھوں سے غم کا سیلاب اُمڈ پڑا۔

لیکن جلد ہی انہوں نے خود پر قابو پالیا اور مڑ کر گھر کے لوگوں کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا...... ہر چہرے پر خوف و دہشت کے خوفناک سائے تھے اور وہ کچھ کہے بغیر نقاب اوڑھ کر لالہ کے ساتھ چل پڑیں۔

تیز قدموں سے چل کر، جب وہ دونوں اس میدان کے قریب پہنچے تو اس وقت رات کے منحوس سائے کو ڈھیرے ڈھیرے بڑھتے اُجالے نے نگل لیا تھا۔ اور اس اجالے میں ان دونوں کے علاوہ بھی کئی لوگ نظر آئے جو آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب کر اس میدان میں بکھری پڑی خون سے لت پت لاشوں میں سے کسی اپنے کو ڈھونڈھ رہے تھے۔ لالہ اور بیگم حامد علی کی بھیگی نگاہوں نے حامد علی کی لاش کو تلاش کر لیا۔ اور بڑی عجلت کے ساتھ وہیں مٹی میں دفن کر دیا۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا اور جب قدرے سکون کا ماحول ہوا، تب لالہ اور بیگم احساس ہوا کہ خوف اور جلد بازی میں ان دونوں نے مولانا کی لاش کو دفن کرتے وقت پورب پچھم کا خیال نہیں رکھا...... لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس لئے لالہ نے بیگم صاحبہ کے مشورہ سے مولانا کی قبر کو چوکور بنوا دیا۔ ایسی غلطیاں کئی لوگوں نے عجلت میں کی تھیں! اس لئے اس میدان میں چوکور قبریں کئی ہیں۔ اور خاص بات یہ ہے کہ اس قبرستان میں انگریزوں کے ظلم و تشدد کے شکار کئی مولانا اور پنڈیت اس جگہ دفن ہیں......

پریم کی بات جاری تھی اور میرے ذہن میں خیالات کی آندھیاں چل رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا، ایسی بے مثال دوستی، محبت اور اتحاد کی خوشبو ایسے ہی ہزاروں لالہ ہری داس اور مولانا حامد علی کی وجہ کر باقی ہے ورنہ عاقبت نا اندیشوں نے تو ایسے خوشبو والے باغوں کو جلا کر راکھ کر دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے......

میں یہ سوچتا ہوا پریم کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ریستوراں سے باہر نکل گیا!!!

☆☆☆☆☆☆

سلسلہ بھوک کا

اُسے قیمت مل گئی اور وہ پل بھر کے لئے بہت خوش ہوگئی۔ اس کی منشا پوری ہوگئی تھی — روپے سے بھری ہتھیلی کو اس نے اپنی انگلیوں سے بھینچ لیا...... اس کے دل میں اس وقت طرح طرح کے احساسات و جذبات کی لہریں اُٹھ رہی تھیں...... آج کئی دنوں کے بعد اس کی جھونپڑی میں رکھا مٹّی کا چولہا جلے گا، بھات دال اور آلو کا چوکھا بنے گا۔ بھوک سے نڈھال اس کے پانچوں بچّے...... پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گے...... لیکن...... لیکن...... آج بچوں کے درمیان ننھکی نہیں ہوگی۔

ننھکی چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب کی پیاری تھی۔ سبھی اسے بے حد پیار کرتے تھے۔ اسے چھیڑ کر مزہ لیتے، اسے گود اُٹھائے رہتے...... تھی بھی وہ بہت معصوم اور چنچل سی، گوری چٹّی، خوبصورت اور ہر وقت طرح طرح کی اپنی توتلی زبان میں پیاری پیاری باتیں کرنے والی...... اگر...... کمی تھی تو بس یہ کہ چار سال کی عمر کی ہوکر بھی وہ جھونپڑی کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ مفلسی اور غربت کیا ہوتی ہے، اسے وہ نہیں جان سکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر چولہا جب ٹھنڈا ہوتا اور جھونپڑی میں کچھ بھی کھانے کو نہیں ہوتا تو اس کے دوسرے بھائی اور بہنیں، ماں کی پٹائی کے خوف سے سہمی سہمی بھوک کی آگ کو دبائے رہتیں۔ لیکن ننھکی

''بھوک''، ''بھوک'' کی رٹ لگائے رہتی۔

''مائی کچھ کھائے کو دے بھوک لگل ہئی''

ایسے جملے بول بول کر وہ روتی رہتی، بلکتی رہتی۔ ماں جھنجھلا کر اس کی بھی پٹائی کر دیتی۔ پھر بھی اس کی ''بھوک''، ''بھوک'' کی رٹ ختم نہیں ہوتی۔ اور اسی بھوک بھوک کی اسے سزا ملی کہ نہ صرف اس کی بلکہ پورے گھر کی بھوک مٹانے کے لئے اسے صرف پانچ سو روپے میں ماں نے فروخت کر دیا!

پانچ سو روپے فاقہ زدہ چھ افراد کے لئے بہت ہوتے ہیں...... دس بارہ دن تو وہ لوگ اطمینان سے پیٹ کی آگ کو سرد کر ہی سکتے ہیں۔

تھکی کی ماں رمیا کے قدم جہاں ایک طرف اس خیال سے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ آج کئی دنوں بعد فاقہ کشی کا خاتمہ ہوگا وہیں دوسری جانب اس کی نظروں کے سامنے تھکی کا پیارا سا معصوم چہرہ بھی گھومنے لگتا، تو اس کے قدم بوجھل ہونے لگتے، سونی، سونی خالی گود بھی اُسے بڑی بھاری بھرکم لگ رہی تھی...... پانچ سو روپے لے کر اس نے جب تھکی کو ایک اجنبی شخص کے حوالے کیا تھا۔ اس لمحہ اسے محسوس ہوا تھا، جیسے وہ اپنے جسم کا کوئی انگ اُس کے حوالے کر رہی ہے...... تھکی اس بات سے بے خبر کہ اسے روٹی اور مٹھائی دلانے کی لالچ دے کر اسے اپنے ساتھ لے جانے والا شخص اس کی قیمت دے کر اسے کہیں لے جا رہا ہے۔ وہ حیران بھری نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن روٹی اور مٹھائی ملنے کی خوشی میں، وہ اُس اجنبی شخص کے ساتھ خوشی خوشی چلی جا رہی تھی...... مگر بار بار مڑ کر اپنی ماں کو ضرور دیکھ رہی تھی، جو پتھر کا مجسمہ بنی کھڑی اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل ہوتے تک رہی تھی اور جب وہ پوری طرح نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تب وہ واپسی کے لئے اپنی جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

راستے ہی میں رک کر بنیا کی دوکان سے اُس نے چاول، دال، آلو، نون، تیل وغیرہ خریدا اور چند ساعتوں بعد بوجھل اور بھاری قدموں سے وہ اپنی جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی بھوک سے نڈھال اس کے پانچوں بچے اس کے قریب آ گئے اور اس

کے ہاتھوں میں چاول، دال اور آلو وغیرہ دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑے۔ کئی دنوں سے پانی پی پی کر پیٹ کی آگ کو سرد کرنے کی کوششوں میں لگے پانچوں بچوں کے چہروں پر خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ اور ایک ساتھ تمام بچوں نے آواز لگائی......

''مائی جلدی کھانا پکا' بڑی جور کی بھوک لگی ہئی''

نڈھال اور اندر ہی اندر ٹوٹی ہوئی ماں چولھے کے قریب پہنچ گئی...... اچانک بچوں کو خیال آیا کہ ماں کی گود خالی ہے، ننھکی ساتھ میں نہیں ہے۔ پھر ایک ساتھ تمام بچوں نے ماں سے سوال کیا......

''ارے مائی، ننھکی؟''

ماں چپ رہی۔ بولتی بھی تو کیا؟ بچوں نے غور سے ماں کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔

ماں خاموش تھی اور اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہہ رہے تھے۔ بچوں نے پھر اپنے سوال کو دہرایا......

''مائی ننھکی کِہنے ہئی......؟''

بچوں نے سمجھا ننھکی کو شاید ماں نے جھونپڑی کے باہر ہی چھوڑ دیا ہو۔ سارے بچے ایک ساتھ جھونپڑی سے باہر نکلے اور ننھکی کو تلاش کرنے لگے۔ لیکن انہیں ننھکی کہیں نہیں نظر آئی۔ حیران ہو کر وہ پھر جھونپڑی کے اندر واپس آئے اور پھر وہی سوال دہرایا۔

''مائی ننھکی کِہنے ہئی......؟''

ماں اس وقت تک چولھے میں جلاون ڈال چکی تھی۔ دھواں اٹھنے لگا تھا اور اُٹھتے دھوئیں کے مرغولے میں ماں کا وجود کھو سا گیا تھا۔

بچوں نے اپنے آپ کو کچھ سمجھانے کی کوشش کی اور پریشان حال ماں کو مزید پریشان نہ کرنے کے خیال سے خاموش رہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد پانچوں بچوں کو ٹوٹی پھوٹی پلیٹوں میں کھانا مل گیا اور وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ ماں خاموش مجسمہ بنی رہی، اسے رہ رہ کر ننھکی کی یاد ستائے جا رہی تھی......

اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو کا ہر بوند نھکی کی یاد دلا رہا تھا۔

رمیا روئے جا رہی تھی اور دل کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی...... کہ اس کے سوا اس کے سامنے اور چارہ ہی کیا تھا...... چھ سال اس کی شادی کو ہوئے تھے اور ان چھ برسوں میں اس کا شوہر اسے چھ بچوں کا بھاری بوجھ دے کر چل بسا۔ اس نے لوگوں کے گھروں میں دائی کا کام کر کے بچوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے ویسے ویسے ان کے پیٹ کا دوزخ بھی بڑھتا گیا۔ بُری نظر ڈالنے والوں نے اس پر بُری نظر بھی ڈالی۔ طرح طرح کے لالچ بھی دیئے۔ لیکن وہ کسی دوسری ہی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ عصمت گنوا کر پیٹ بھرنے پر وہ کبھی رضا مند نہیں ہوئی ...... وہ خود اندر ہی اندر ٹوٹتی رہی، بکھرتی رہی۔ لیکن اپنے بچوں کو سمیٹنے کی کوشش میں کبھی کمی نہیں کی...... فاقہ پر فاقہ تنگ دستی اور بدحالی سے نڈھال وہ بیمار بھی رہنے لگی اور ان ہی سب حالات سے مجبور ہو کر نھکی کی بھوک بھوک کی رٹ کو مٹانے اور دوسرے بچوں کی وقتی بھوک کو ختم کرنے کے لئے اس نے دل پر بھاری بوجھ رکھ کر نھکی کو پانچ سو روپے میں بیچ دیا۔

لیکن پانچ سو روپے بھی زیادہ دن نہیں چلے اور پھر جھونپڑی کے اندر بھوک سے تڑپتی ہوئی کراہیں گونجنے لگیں۔ تب نھکی کے بعد چھونکی بکی۔ مگر چھونکی کے بعد بھی بھوک کی جوالا سرد نہیں ہوئی تب گورکی کا نمبر آیا اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا تب تک وہ ہمت ہار چکی تھی ......اور ایک دن اس نے اپنے دونوں بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ کوئیں میں چھلانگ لگا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھوک کا خاتمہ کر دیا۔

وقت گزرتا رہا۔ نھکی، چھونکی اور گورکی کا اپنے جن بھائی بہنوں اور ماں کی بھوک مٹانے کے لئے ایک بار سودا ہوا تو ہمیشہ ان کا سودا ہی ہوتا رہا۔ اپنی ماں اور بھائیوں کی بھوک تو وہ نہیں مٹا سکیں۔ ہاں زندگی کی چندھیا دینے والی روشنی سے نہائے امیر لوگوں کی دوسری بھوک مٹانے کا ایک ذریعہ ضرور بن گئیں۔!!!

☆☆☆☆☆☆

ڈھند میں کھویا سب کچھ

(۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کے نام)

''.....آئے دن جس طرح کے ناپسندیدہ حادثات اور واقعات رونما ہو رہے ہیں، ان کی ہر سطح پر مذمت ہونی چاہئے۔ ورنہ آنے والے دنوں میں حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے اور ان پر کسی کا قابو نہیں رہے گا......''

......اور یہ کہہ کر انھوں نے آنکھیں موندلیں، لبوں پر کچھ جنبش ہوئی اور پھر جسم ڈھیلا پڑ گیا، روح پرواز کر گئی۔

یہ دیکھ کر لوگوں پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اب جب کہ ایک صدی کے اختتام کو بس چند لمحے رہ گئے تھے۔ نئی صدی کا سفر شروع ہونے والا ہے۔ اتنے اہم وقت اور ایسے لمحے میں ان کا دنیا سے کوچ کر جانا، یہ اچھا شگون نہیں ـــــ لیکن وہ تو روانہ ہو چکے تھے، اپنے آخری سفر پر، پھر کبھی واپس نہیں آنے کے لئے۔

اب کیا ہوگا......؟

لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے سوالات سر ابھار رہے تھے، لیکن جواب کسی کو نہیں مل پا رہا تھا، لوگ جواب کے لئے اِدھر اُدھر ایک دوسرے کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، شاید کسی کے پاس جواب ہو۔ کوئی یہ بتائے کہ وہ ایسے وقت میں، ایسے لمحے

میں کیوں دنیا کو چھوڑ گئے، جب کہ دنیا کو ان کی بڑی سخت ضرورت تھی۔

کسی نے کہا ان کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں اُس کی وہ تاب نہیں لا سکے، کسی نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ ان کا دل آئے دن ہو رہے حادثات اور واقعات سے ٹوٹ چکا تھا۔ اس لئے وہ برائیوں اور بداعمالیوں کی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی زبان گنگ تھی اور ان کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ محاسبہ اور موازنہ کا اس سے بہتر وقت کیا ہو سکتا تھا۔ جب ایک صدی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ نئی صدی کی سُپیدی پھیلنے والی تھی۔ اور سامنے امن اور مساوات کے پیابر کا بوڑھا اور بے جان جسم پڑا تھا۔ اس بوڑھے اور باریش بزرگ نے وقت کے نہ جانے کتنے تیز جھکڑوں کو دیکھا اور محسوس کیا ہوگا۔ کتنی امیدوں اور ناامیدوں کے تلاطم سے وہ گزرا ہوگا۔

ابتدائی نصف صدی تو اس شخص نے لوگوں کو اپنے حقوق کے حصول کے لئے اپنے سروں پر کفن باندھے دیکھا، ہزاروں لاکھوں معصوم اور بے گناہوں نے ان کی نظروں کے سامنے ایثار و قربانی کے جذبہ سے سرشار ہو کر حق کی راہ میں جان گنوادی، اور جب ان کے بہائے خون نے رنگ دکھایا اور انہیں ان کے حقوق قسطوں میں دینے کی باری آئی تو ایک بار پھر انہیں آزمائش میں ڈال دیا گیا۔ وقت اور حالات کے سوداگروں نے جسم و جان کا سودا کر کے انہیں تقسیم کا گہرا زخم دیا ———— اور ان زخموں کو مندمل نہیں ہونے دیا۔ جب کبھی حالات اپنے ناموافق دیکھتے ان زخموں کو ادھیڑتے اور رستے ہوئے زخم کے لہو سے اپنے مفاد کو سرخرو کرتے، ان زخموں کو اتنی بار کھرچا گیا، ادھیڑا گیا کہ وہ ناسور بن گئے اور سوداگروں کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ زخموں کے لہو کو چاٹ چاٹ کر سوداگر آدم خور بنتے گئے اور ہر سمت ظلم و بربریت کا ننگا ناچ ہونے لگا اور اس حیوانی رقص و سرور میں اضافہ ہوتا چلا گیا، جسم و جان کو بانٹنے کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ جسم کے اندر دوڑتے ہوئے گرم گرم لال لال لہو کے رنگ میں نفاق کا زہر آئے دن اپنا اثر دکھانے لگا...... گلیوں میں، چوراہوں پر، سڑکوں پر، دوکانوں میں، مکانوں میں، کھیتوں میں، کھلیانوں میں بے حد قیمتی خون بہائے جانے لگے —— یہ خون جو اس طرح زاروں اور شدّادوں کے نیزے سے

بہائے جارہے تھے، اس خون سے وقت اور لمحوں کے گرد لپٹی سیاہی کو دھو کر نہ جانے کتنی جگمگا ہٹ لے آتے۔ لیکن سوداگروں کو تو ان جگمگاتے وقت اور لمحوں سے شدید نفرت تھی۔ اس لئے کہ ان کا سارا کاروبار اندھیرے کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ روشنی کے یہ دشمن اندھیرا پھیلانے کے لئے ہر جتن کرتے...... اندھیرے کے ان سوداگروں نے اپنی تجارت کو مزید فروغ دینے کے لئے اور اپنی ہوس کی تسکین کی خاطر فاختاؤں کا بھی شکار کرنا شروع کر دیا — انہیں جہاں کہیں بھی فاختائیں نظر آتیں، وہ ان کا خاتمہ — کر دیتے اور فاتحانہ قہقہہ لگاتے۔ فاختاؤں کا شکار کرتے کرتے ان لوگوں نے کبوتروں کے غول پر بھی حملہ شروع کر دیا۔ جن جن میناروں اور گنبدوں کو ان کبوتروں اور فاختاؤں نے برسہا برس سے اپنی آماجگاہ بنا رکھا تھا۔ وقت اور لمحوں کے یہ سوداگر ان کبوتروں کی ان آماجگاہ کو بھی اجاڑنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے اور اس دن تو سارے سفید ریش بزرگ جو صدیوں پرانی روایتوں پر گہری نظر رکھتے تھے چونک پڑے تھے اور آنے والے خوفناک لمحوں کی دھمک سے سہم گئے تھے، جس دن ایک پرانے گنبد پر سے کبوتروں کی آماجگاہ کو ان سوداگروں نے بھیانک اور فلک شگاف نعروں کے ساتھ اجاڑ دیا تھا۔ دھماکے کی وحشتناک اور خوفناک آواز سے اس گنبد کے کبوتر فاختائیں پھڑ پھڑا کر ایک بارگی اُڑیں تو پھر اس جانب کبھی منہ نہیں کیا۔

بزرگوں نے کہا یہ اچھی علامت نہیں۔ کبوتروں اور فاختاؤں کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ یہ جس جگہ اپنی آماجگاہ بناتے ہیں اُس جگہ کے آس پاس ہر طرح کی خوشحالی اور امن و آمان کی فضا قائم رہتی ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ اس جگہ کو چھوڑتے ہیں اس جگہ نحوست کا دار دورہ ہو جاتا ہے۔

بوڑھے باریش بزرگ نے ان کبوتروں فاختاؤں کو دوبارہ لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہاتھ میں اناج کی ٹوکریاں لئے ادھر ادھر اناج چھینٹتے رہے اور ''آؤ آؤ'' کی صدائیں زور زور سے لگاتے رہے۔ لیکن ان کی ہر کوشش ناکام رہی آؤ......آؤ کی صدا لوٹ آتی۔ مایوسیوں سے نڈھال یہ باریش بزرگ آنے والے کسی بڑے طوفان کی صاف دھمک سن رہے ہیں۔ آنے والے اس منحوس وقت اور ان لمحوں کا جو بڑے طوفان میں بدل جائیں گے

اور ممکن ہے یہ طوفان، طوفان نوح میں نہ تبدیل ہو جائے۔

وقت اور لمحے اس قدر مایوس کن ہو گئے کے ایک ماں تھی شفقت، محبت اور ممتا کی مجسم تصویر جس کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ بھی سرنگوں ہوئے، وہ بھی چلی گئی، کبھی واپس نہیں آنے کے لئے ــــ اور اب یہ بزرگ ــــ جو بادشاہ وقت نہ ہو کر بھی اپنے کردار اور عمل سے بادشاہ تھے ــــ ان پر اس قدر اعتماد اور اعتبار تھا کہ مقام مقدس کی ایک کنجی ان کے حوالے کی گئی تھی۔

آج یہ بھی روانہ ہو گئے ــــ کبھی نہیں لوٹنے کے لئے ــــ گنبدوں اور منیاروں کی فاختائیں اور کبوتر بھی غائب ہو گئے ہیں ــــ اب ان فاختاؤں اور کبوتروں کو کون صدائیں دے گا؟ کون انہیں واپس بلانے کی کوشش کریگا؟ صدی کا بالکل آخری وقت اور آخری لمحہ ــــ کہ بس چند ساعتوں بعد ہی نئی صدی کا سفر شروع ہونے والا ہے اور اس سفر کے چند لمحوں کے قبل کی صورت حال یہ ہے کہ باریش بزرگ اپنے آخر سفر پر روانہ ہو گئے۔ سوداگر، بڑے سوداگروں کے آگے سرنگوں ہیں اور آنے والے وقت اور لمحوں کے امین دنیا و مافیا سے بے خبر رقص و سرور کی محفل سجائے جھوم رہے ہیں، گا رہے ہیں اور ٹک ٹک کرتی گھڑی کی سوئی جیسے ہی ۱۲ پر آتی ہے۔ ہر طرف سے شور، پٹاخے کی آواز آتش بازیوں کا نظارہ ــــ پھر صبح ہوتی ہے لیکن ہر سمت دھند ہی دھند چھائی ہوئی ہے اور اس گہری دھند میں جیسے سب کچھ کھو گیا ہے اور اجالے کا دور دور تک پتہ نہیں!!!

☆☆☆☆☆

بوجھ زندگی کا

مفلسی کی زندگی اپنے آپ میں ایک بوجھ ہوتی ہے اور اس بوجھ میں بیوی سمیت تین بٹیاں، ایک بٹیا اور ایک بیوہ بہن کے اضافہ نے غربت اور مفلسی سے نڈھال سلیمان کی زندگی کی ساری رعنائیوں کو ختم کر دیا تھا۔ زندگی کی گاڑی کو سنگلاخ اور خاردار راستے پر کیسے چلایا جائے، یہ سوچ اور فکر اسے ہر پل، ہر لمحہ پریشان کیئے رہتی۔ اس کے گرد مکڑی کا ایک ایسا جالا بُن دیا گیا تھا کہ جب کبھی وہ اس سے نکلنے کی کوشش کرتا وہ مزید الجھتا چلا جاتا۔

گاؤں کے ساہو کار کے کھیت کھلیانوں میں دن رات مزدوری کرتا، اناج اگاتا...... چاول، گیہوں، دال کے ڈھیر لگا دیتا۔ لیکن وہ خود دانے دانے کو محتاج رہتا۔ اس کی کڑی محنت ومشقت سے جب کھیت لہلہانے لگتے، اناج کے انکور پھوٹتے۔ کھیتوں سے خوشبو پھیلتی تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ اسے اپنی محنت پر بڑا گمان ہوتا۔ لیکن شاندار فصل تیار ہونے کے بعد بھی اسے ہر روز کی طرح وہی دو سیر اناج ملتا۔ جس میں سے ایک سیر بیچ کر وہ نون تیل وغیرہ لیتا اور بقیہ ایک سیر اناج لے کر شام گئے گھر پہنچتا، جہاں گھر کے سارے لوگ دروازے پر ٹکٹکی لگائے اس کا انتظار کرتے رہتے کہ سامان آیے تو مدھم پڑتی زندگی کی لو کو کچھ

تیز کرنے کے لئے ،ان لوگوں کی زندگی کی طرح ٹھنڈے ہو رہے چولھے کو گرم کیا جائے۔

ماں باپ مرتے مرتے ایک بہن کا مزید بوجھ اس کے ناتواں کاندھے پر ڈال گئے تھے۔ساہوکار سے قرض لے کر ایک فرض پورا کیا اور بہن جس دن ڈولی میں رخصت ہوئی،اس دن اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی تھی،اس دن وہ بڑے سکون کی نیند سویا تھا......لیکن اس کی نیند کا خمار ٹوٹا بھی نہیں تھا کہ ایک ماہ بعد ہی اس کی جو بہن سہاگن رخصت ہوئی تھی،وہ بیوہ بن کر ایک بار پھر گھر واپس آ گئی......اس نے قدرت کے اس فیصلے کو بھی ایک آہ کے ساتھ قبول کرلیا اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

وقت دبے پاؤں نکلتا چلا گیا۔زندگی میں جب شادابی اور رعنائیاں ہوتی ہیں تو وقت کو روک لینے کو جی چاہتا ہے۔لیکن ایسا وقت جو صرف تاریکی ہی تاریکی لے کر آئے، اور گھپ اندھیرا کر جائے،ایسے وقت کا جتنا جلد ہو،گزر جانا ہی اچھا ہے۔اور یہ وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ سلیمان کی تینوں بیٹیاں ایک ساتھ جوان ہو کر اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسانے لگیں۔

ایک بیٹا عثمان ہے جو اس کے جینے کا سہارا ہے۔ایک نہ ایک دن وہ اس کی زندگی کے بوجھ کو ضرور کم کرے گا۔اس کی تاریکیوں سے بھری زندگی میں ضرور روشنی لائے گا۔یہی سوچ کر اس نے اسے سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ڈال دیا تھا۔ لوگوں نے اسے سمجھایا بھی کہ اپنے بیٹا کو بھی محنت مزدوری میں لگادو۔وہ بھی دو پیسہ کمائے گا۔لیکن اس نے لوگوں کی یہ بات نہیں مانی......اور ایک دن جب عثمان سرکاری اسکول سے ایک کاغذ ہاتھ میں لئے خوشی خوشی دوڑتا بھاگتا آیا اور کہا......

''بابا،بابا میں میٹرک پاس کر گیا''

تو یہ سن کر سلیمان خوشی سے اچھل پڑا،دوڑ کر اس نے عثمان کو گلے سے لگا لیا۔ عثمان کی ماں اور بہنیں بھی اس کے قریب آ گئیں اور اس کے گلے لگ گئیں......

اس دن سلیمان نے خود کو بڑا ہلکا محسوس کیا۔ اسے ایسا لگا جیسے زندگی کے جس بوجھ کو وہ ڈھوتے ڈھوتے لڑکھڑانے لگا ہے، اسے سہارا دینے کے لئے عثمان کے مضبوط ہاتھ مل جائیں گے اور دونوں باپ بیٹے مل کر زندگی کے اس بوجھ کو کم کر دیں گے۔

وقت شاید اب اس پر مہربان ہونے لگا تھا...... ایک دن عثمان کے دوستوں نے اُسے بتایا کہ شہر میں میٹرک پاس نو جوانوں کو فوج میں بھرتی کیا جارہا ہے۔ یہ سن کر عثمان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس کے سپنے انگڑائیاں لینے لگے اور وہ خود کو شہر جانے سے روک نہ سکا اور سخت امتحان سے گزرنے کے بعد جب عثمان کو اس کا نام منتخب ہونے والے نو جوانوں میں نظر آیا تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ پاس کھڑے نو جوانوں سے وہ بار بار یہ پوچھتا، یہ میرا ہی نام اور رول نمبر ہے نا؟ اور لوگ اسے یقین دلاتے کہ ہاں یہ تمہارا ہی رول نمبر ہے۔

عثمان کی اس کامیابی نے اس کی بے جان زندگی میں جان ڈال دی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بھری دوپہر کو صحرا میں چلتے چلتے اچانک وہ ایسے مقام پر آ کھڑا ہوا ہے جہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے جھرنے کی مترنم آواز ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں جو اس کی رگ و پے میں سرایت کرتی چلی جارہی ہیں۔

فوجی ٹریننگ کے بعد اسے ایک چھاونی میں بھیج دیا گیا۔ ملنے والی تنخواہ کی آدھی رقم کو وہ اپنے بابا کو بھیجنے لگا اور خط میں خاص تاکید بھی کرتا کہ ساہوکار کا قرض اُتار دے اور بہنوں کی شادی مناسب جگہ طئے کر دے۔

سلیمان، بیٹے کے بھیجے ہوئے روپے لے کر بہت خوش ہوتا اور کوشش کرتا کہ ساہوکار کے قرض کا بوجھ اُتار دے اور بیٹیوں کی بھی شادی کر دے...... لیکن اس کا بوڑھا نحیف اور لاغر جسم اب محنت مزدوری کے لائق نہیں رہا تھا، عثمان کے بھیجے ہوئے روپے سے بس اب گھر میں دو وقت کی روٹی ہو جاتی، بوڑھا بوڑھی کی دوائیں آجاتیں اور بہنوں کے جوان جسم کو ڈھکنے کے لئے کپڑے مل جاتے۔ قرض کی ادائیگی اور بیٹیوں کی شادی کا مسئلہ جوں کا

توں بنا رہا اور فکر کی چادر لمبی ہوتی گئی۔

اچانک ایک دن عثمان کا خط ملا...... سرحدوں پر جنگ کے بادل منڈرا رہے ہیں، اس لئے مجھے بھی جنگ کے مورچہ پر بھیجا جا رہا ہے۔ ہمارے لئے دعا کرتے رہنا، پیسے آپ کو ملتے رہیں گے......

اور کچھ دنوں بعد جنگ شروع ہو گئی۔ گاؤں میں لوگوں کے ریڈیو اور ٹرانزسٹر سے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دینے کی خبریں آنے لگیں۔ گاؤں کے لوگ اُسے مبارک باد دیتے، تمہارا بیٹا بہادری سے لڑ رہا ہے۔ اب تو اس کی ترقی بھی ہو جائے گی۔ سلیمان کا سینا فخر سے پھولنے لگتا اور اس کی سوچ کا دائرہ پھیلتا چلا جاتا۔

جنگ دھیرے دھیرے ختم ہونے لگی۔ دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد فوج اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹنے لگی...... کہ اچانک ایک دن گاؤں میں فوج کی ایک گاڑی داخل ہوئی' گاؤں والوں نے سمجھا' عثمان جنگ سے واپس آ گیا ہے۔ پورا گاؤں اس کے استقبال کے لئے فوج کی گاڑی کے پیچھے پیچھے دوڑ پڑا...... گاڑی ٹھیک سلیمان کے گھر کے قریب رکی۔ اور ایک فوجی افسر نے گاڑی سے اتر کر، سلیمان کے بارے میں پوچھا۔ سلیمان تذبذب کے عالم میں آگے بڑھا۔ ''ہاں میں عثمان کا بابا سلیمان ہوں، کیا بات ہے''؟

فوجی افسر اس کے قریب آیا اور اس کے کاندھے پر بڑی ملائمیت اور محبت سے ہاتھ رکھ کر بڑے ہی غمناک انداز میں خبر سنائی۔ اور اس خبر کو سن کر سلیمان کے پیروں تلے کی زمین کھسک گئی۔ یہ کیا ہوا؟ اور وہ روتا چلاتا، خشک پتوں کی طرح کانپتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوا۔ اسے روتا دیکھ کر گھر کے اندر کے لوگوں کو بھی سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کسی مصیبت کا پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑا ہے...... گھر کے اندر سے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ پورا گاؤں سکتے کے عالم میں آ گیا اور غم کے گھنے بادل گاؤں پر چھا گئے۔ ایسا لگا جیسے گاؤں

میں نکلی چمکیلی دھوپ اچانک ختم ہوگئی ہو اور ہر طرف گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا ہو۔

فوجی افسر اداس اداس سا کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ چند گھنٹوں بعد اس نے سلیمان کو پھر اپنے قریب بلایا......اور کہا......''عثمان کی لاش دشمنوں کے قبضے میں ہے، حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ویسے ملنے کی امید کم ہے۔ فی الحال یہ پانچ لاکھ کی رقم کا چیک آپ کو دی جارہی ہے۔ ہم پھر آئیں گے...... '' یہ کہتا ہوا فوجی افسر گاڑی میں بیٹھ کر واپسی کے لئے روانہ ہوگیا۔

فوجی افسر سلیمان کو ایک بڑا زخم اور اس زخم کو مندمل کرنے کے لئے پانچ لاکھ روپئے کا مرہم بھی دے گیا...... پانچ لاکھ روپئے کبھی اس کے ہاتھ میں ہونگے، اس نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ سوچا تھا، اس کے تصور سے بھی وہ دور بہت دور تھا۔ اس پانچ لاکھ سے وہ بہ آسانی ساہوکار کا قرض اُتار سکتا ہے۔ تینوں بیٹیوں کی شادی کر سکتا ہے اور باقی بچی زندگی کے دن کو آسانی سے کاٹ سکتا ہے......اس کا بیٹا مرتے مرتے بالآخر اس کی ساری پریشانیوں کو دور کر گیا۔ وہ اچھی طرح یہ بات جانتا تھا کہ عثمان کی تنخواہ سے ساہوکار کا وہ قرض اتار سکتا تھا اور نہ ہی بیٹیوں کی شادی۔ لیکن اسے اب اطمینان تھا۔

وقت گزرتا گیا، غم کے کالے گھنے بادل دھیرے دھیرے چھٹ گئے تھے اور پہلے کی طرح پورے گاؤں میں سنہری دھوپ پھیلنے لگی تھی۔ اس دوران سلیمان نے دوڑ دھوپ کر تینوں بیٹیوں کی شادی دوسرے گاؤں میں طئے کر دی اور ایک دن وہ وقت بھی آیا جب گھر کے ماتمی سناٹے کے درمیان شادی کی دھوم دھام تھی۔ ایک ساتھ تین تین برات آرہی تھی۔

اسی روز اچانک ایک فوجی گاڑی گاؤں میں پھر نمودار ہوئی......اس گاڑی کو دیکھ کر گاؤں والوں کا غم تازہ ہوگیا......اس بار بھی وہ گاڑی سلیمان کے گھر کے قریب رکی، دروازہ کھلا، ایک فوجی اندر سے برآمد ہوا، زخموں سے چور، نڈھال، اس کی آنکھوں سے

سمندر جھانک تھا چہرے پر اُگی بے ترتیب داڑھی اس کی پریشانیوں اور ہولناکیوں کی داستان سنا رہی تھی......لیکن ہونٹوں پر زندگی سے بھری مسکراہٹ تھی۔

اس نوجوان کو لوگ غور سے دیکھتے رہے اور اچانک سارے لوگ خوشی سے اچھل پڑے۔ارے۔عثمان؟ یہ تو عثمان ہے۔

عثمان اپنے ایک فوجی دوست کا سہارا لئے آگے بڑھا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا،گھر کے اندر سے ایک بار پھر رونے کی صدائیں گونجنے لگیں......

اس وقت یہ سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ رونے کی یہ صدائیں' خوشی کے ہیں یا غم کے!!!

☆☆☆☆☆

دشمن روشنی کے

آج میں تقریباً بیس برسوں بعد اپنے آبائی گاؤں شانتی نگر میں داخل ہوا ہوں۔
طیارہ کے سفر کے بعد ٹرین کی لمبی مسافت اور پھر ٹیکسی کی اوبڑ کھابڑ روڈ پر ہچکولے..............عام حالات میں تو میں تھک کر چور ہو جاتا، لیکن اپنے لوگوں سے ملنے اور اپنے پرانے شہر کو دیکھنے کی خوشی نے سفر کی ساری تھکان کو قریب نہیں آنے دیا تھا...... میری بیوی کے چہرے پر بھی خوشیوں کا پرتو جھلک رہا تھا، ہاں دونوں بچے ہم دونوں کی اندرونی خوشی سے بے خبر کافی تھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

ٹیکسی روڈ کی خستہ حالت کی وجہ کر کافی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی، اس کی پچھلی سیٹ کی دائیں جانب میری بیوی بیٹھی تھی درمیان میں میری بیٹی ثمینہ، بائیں جانب کی کھڑکی کے قریب' میں بیٹھا تھا اور بیٹا اگلی سیٹ پر براجمان تھا۔ سبھوں کی نگاہیں شہر کی مختلف عمارتوں اور چوراہوں کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ مجھے کچھ ایسی دوکانیں اور عمارتیں نظر آئیں جو نئے رنگ و روپ لے چکی تھیں، انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں میں بجھ سا جاتا، لیکن جب مجھے کوئی مکان یا دوکان اُسی پرانی حالت میں نظر آئے انہیں دیکھ کر مجھے بڑا اچھا لگتا، جی چاہتا ٹیکسی رکواؤں اور بے اختیار اس پرانی دوکان و مکان کے قریب پہنچ جاؤں اور ان جگہوں کو

بہت قریب سے دیکھوں، چھوؤں، جہاں پر کبھی کسی لمحہ میرا مس تھا' میرے ابا اور دادا جان کو جن درودیوار نے دیکھا تھا۔

میں ان ہی احساسات و جذبات کے تلاطم میں ڈوب ابھر رہا تھا کہ اچانک ایک چوراہے پر ایک ننگے وجود کو دیکھ کر میں چونک پڑا، بے اختیار میں نے ٹیکسی رکوائی اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر تقریباً دوڑتا ہوا اس وجود کے قریب گیا، اور نزدیک پہنچ کر میں نے جو کچھ دیکھا ......اسے دیکھ کر میرے احساسات و جذبات کی ساری روشن قندیلیں اچانک بجھ گئیں۔

میں بہت ہی تھکے قدموں سے واپس آیا' بجھے دل سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور بڑی خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میری اس حالت کو دیکھ کر میری بیوی اور بچوں نے ایک ساتھ سوال کیا......

''کیوں' کیا ہوا''

''نہیں کچھ نہیں'' بس یوں ہی...... میری آواز میں نقاہت تھی، بے دلی سے جواب دے کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اپنی آنکھیں میں نے ضرور موند لی تھیں لیکن میرے دل و دماغ میں برسات کی موسلا دھار بارش میں جیسے بجلیاں کوندتی ہیں ویسی ہی بجلیاں کوندنے لگیں یہ بجلیاں اندھیری رات کو لمحہ بھر کے لئے روشن تو ضرور کر دیتی ہیں لیکن ان کی کرخت اور بھیانک آواز پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں............کوندتی ہوئی ان بجلیوں کی روشنی میں میری یادیں جھلملانے لگیں، وحشتناک اور ہیبت ناک۔

اب سے بیس سال قبل اچانک میرے اوپر ایک بجلی ایسی گری کہ میرے پورے وجود کو بکھیر دیا......اور میں اپنے سینے پر اپنی بے بسی اور بے کسی کا پہاڑ لئے اپنی بیوی کے ساتھ اس شہر کو ہی نہیں ملک کو بھی خیر آباد کہنے پر مجبور ہوا۔

میری بیوی نرگس، دو سال کا پیارا اور خوبصورت سا بیٹا کیف اور میں......زندگی بڑی پُر بہار تھی......باپ، دادا کی قائم کی ہوئی تجارت کو میں نے اپنی بھرپور محنت سے ترقی کی بلندیوں پر لے گیا تھا......اور ترقی کی یہی بلندیاں، میرے لئے مصیبتوں کا پہاڑ بن گئیں۔

رام اوتار سنگھ جیسے نیک ایماندار اور ہر کے دکھ سکھ کے ساتھی...... جو شہر کے نمائندہ بھی تھے، ان سے میری قربت ان کا اکثر میری دوکان پر آ کر بیٹھنا چائے پینا، پان کھانا اور خوش گپیاں کرنا، شاید......شاید۔

نئے انتخاب میں رام اوتار جی کے مقابلے میں پشو پتی کھڑا ہو گیا تھا......جس دن یہ خبر پھیلی، لوگوں نے دبی زبان میں خوب مذاق اڑایا، ہونھ کہاں رام اوتار جی اور کہاں وہ موالی غنڈہ، قاتل اور زانی پشو پتی......کمبخت کی ضمانت بھی نہیں بچے گی......

لیکن جب الیکشن کا نتیجہ سامنے آیا تو شہر کا ہر شخص حیرت زدہ تھا، یہ کیسے ممکن ہو گیا...... یہ تو ناممکن تھا لیکن غنڈوں کی طاقت اور روپے کی حدت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا...

راتوں رات کایا پلٹ ہو گئی...... پہلے وہ جو جرائم انتظامیہ کے خوف سے چوری چھپے کرتا تھا، وہ اعلانیہ کرنے لگا، آئے دن نوجوان لڑکیاں اغواء ہونے لگیں، دوکانوں، مکانوں، بینکوں میں ڈاکے پڑنے لگے، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا......شہر کے لوگ خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے اور انتظامیہ پشو پتی کی حفاظت میں مستعد تھا۔

ایسا لگنے لگا، جیسے پورے شہر پر کالے بادل چھا گئے ہوں اور کسی سمت سے بھی روشنی کی کوئی کرن نہیں ہر طرف اندھیرے کی حکمرانی......

اسی اندھیرے میں اچانک ایک دن میرے اوپر بھی بجلی کڑکی اور میں کانپ کر رہ گیا......میرا خوبصورت اور پیارا سا دو سال کا بیٹا کیف اغوا کر لیا گیا......اور دوسرے ہی دن پچاس لاکھ روپئے کے مطالبہ کا خط ملا......

میں ایک بڑی دوکان کا مالک ضرور تھا، لیکن پچاس لاکھ کی رقم دینا میرے لئے ناممکن تھا۔ میں نے اغواء کاروں سے رحم کی بھیک مانگی، مدد کے لئے انتظامیہ کے دروازے کھٹکھٹائے......لیکن میری صدا بے اثر رہی۔

میرے دوستوں نے مشورہ دیا کہ اگر اپنے بیٹے کی زندگی چاہتے ہو تو کسی طرح انتظام کر کے پچاس لاکھ روپئے دے دو ورنہ تمہارا کوئی سننے والا نہیں، یہ شہر ایسے ہی لوگوں کا شہر ہے جہاں سب کے سب اندھے، بہرے اور گونگے ہو گئے ہیں لوگ دیکھتے ضرور ہیں

لیکن کچھ دکھائی نہیں دیتا، سنتے ہیں لیکن کچھ سنائی نہیں دیتا، خوف و دہشت سے تمام لوگوں کی قوت گویائی بھی سلب ہو گئی ہے۔

میں مضمحل چہرہ اور بوجھل قدموں سے گھر واپس آ گیا...... میری بیوی غم اور صدمے سے نڈھال تھی اور اس وقت کچھ امید اور آس لئے مسلسل داخلی دروازے کو تک رہی تھی...... اور مجھے اس طرح خالی ہاتھ لوٹتا دیکھ کر، وہ چیخ پڑی...... کیا ہوا؟ کہاں گیا میرا بیٹا؟ کمبختوں نے نہیں دیا؟ مجھے میرا بیٹا لا دو........... مجھے میرا بیٹا لا دو، کسی بھی حال میں، کسی بھی قیمت پر...... میرا بیٹا لا دو......! اس کی آواز میں اس قدر درد و کرب تھا کہ میں لڑکھڑا گیا۔

میں ہر جانب سے مایوس اور نامراد ہو گیا، تو بڑی مشکلوں سے پانچ لاکھ کی رقم لے کر اغواء کاروں کی بتائی جگہ پر پہنچا' لیکن پچاس لاکھ کی جگہ پانچ لاکھ کی رقم دیکھ کر اغواء کاروں نے میرے اوپر خوب طنزیہ قہقہے لگائے اور کہا ''اتنے سے کام نہیں چلے گا'' جتنا کہا گیا ہے اتنا لے کر آؤ ورنہ...... لفظ ''ورنہ'' میں کون سی دھمکی پوشیدہ تھی یہ سمجھ کر ہی میں کانپ گیا، میں نے ان لوگوں سے بڑی منت سماجت کی لیکن پتھر بھی کہیں پگھلتا ہے؟

ان حالات میں میرے لئے پوری دوکان فروخت کر دینے کے سوا دوسرا کوئی چارا نہیں تھا، اور میں نے بے رحم حالات کے آگے سپر ڈال دی اور پوری دوکان کو فروخت کر دیا...... پورے دس لاکھ کی رقم ملی اور میں پندرہ لاکھ روپے لے کر مطلوبہ جگہ پہنچا...... لیکن اغواکاروں کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں...... مجھے اس جگہ اپنے ننھے سے۔ ، کیف کی سر کٹی ہوئی لاش ملی' اس کی آنکھیں کھلی تھیں جیسے وہ کچھ پوچھنا چاہ رہا ہو۔ اس حالت میں اسے دیکھتے ہی ایک دلخراش چیخ میرے منہ سے نکل گئی اور میں بے اختیار اس سے لپٹ پڑا۔

شہر میں میرے بیٹے کے قتل کے واقعہ کا چرچا کئی دنوں تک رہا لیکن حیرت و استعجاب کسی کو نہیں تھا، اس لئے کہ لوگ ایسے حادثات اور واقعات سننے، دیکھنے اور جھیلنے کے عادی ہو گئے تھے۔

کئی ماہ تک ہم لوگ غموں سے نڈھال رہے اور آخر کار ایک دن ہم نے فیصلہ کر

لیا، اس شہر ہی کو نہیں بلکہ اس ملک کو ہی چھوڑ دینے کا......اور............اور............!

دوسرے ملک میں پہنچ کر ہم دونوں نے نئے سرے سے اپنی زندگی کو سجانے اور سنوارنے کی کوشش کی......یہیں بیٹی شمینہ اور پھر بیٹا شہزاد کی پیدائش ہوئی......حال نے ماضی کے دُھندلکوں کو بھلانے میں کافی مدد کی......لیکن اکثر کیف کی کسک بدن میں جھر جھری پیدا کر دیتی...... چند برسوں بعد ایک دن ہمارے انور بھائی نے فون پر بتایا کہ پشو پستی کا کسی نے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا......اس دن اس خبر پر ہم دونوں بے حد مسرور نظر آئے کہ آخر کار وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔

لیکن آج ..... جب میں بیس برسوں بعد یہاں آیا ہوں اور ایک چوراہے پر جو وجود مجھے نظر آیا، اسے دیکھ کر میں انگشت بدنداں رہ گیا......ٹھیک چوراہے پر جہاں پر میں ٹیکسی سے اترا تھا، وہاں پر میں نے دیکھا پشو پتی کا قد آدم پتھر کا مجسمہ کھڑا تھا اور اس کے ٹھیک نیچے لکھا تھا......''اُمر شہید پشو پتی، جن کا جیون ہمارا آدرش ہے''

اچانک جھٹکے سے ٹیکسی رُکی انور بھائی ٹیکسی کا گیٹ کھول کر مجھے آواز دے رہے تھے، میں چونک پڑا...... بوجھل قدموں سے نیچے اترا اور انور بھائی گلے لگ گئے...... میں انہیں کنارے لے گیا اور پوچھا یہ چوراہے پر پشو پتی کا مجسمہ دیکھا......

ہاں تو اس میں حیرت اور تعجب کی کون سی بات ہے اب تو تمیں یہاں ہر چوراہے پر ایسے ہی پتھروں کے مجسمے اور کتبے نظر آئیں گے!

☆☆☆☆☆☆

الوداع کے بعد

ڈاکٹر نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر راجن کے بازو میں زہر سے بھرا سیرنج لگا دیا' زندگی کی اذیت اور کرب سے نجات کے لئے' اور تھوڑی ہی دیر بعد اسے دکھ درد اور مصائب سے مکتی مل گئی، اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، جیسے بے بس اور مایوسیوں سے بھری موت کے بعد بھی اس کے سامنے سوالوں کا لامتناہی سلسلہ تھا' جو اسے بے قرار کیئے ہوئے تھا۔ سماج کے اندر پھیلی ناانصافیوں، ریاکاریوں، ظلم وتشدد اور استحصال کے خلاف وہ مورچہ لینے چلا تھا، لیکن ان کی جڑیں اتنی گہرائی تک پہنچ چکی تھیں کہ اس کی ساری کوشش ناکام ہو گئیں اور تھک ہار کر اس نے ان طاقتوں کے آگے سپر ڈال دی۔

راجن کی موت نے اس کی بیوی تارا کو خاموش مجسمہ میں تبدیل کر دیا تھا، لیکن دونوں بیٹے، باپ کی موت کے ذمہ داروں کے خلاف چیخ پڑے تھے۔ بڑا بیٹا جو اس وقت تقریباً بیس برس کا ہو چکا تھا۔ اسے باپ کی بے وقت اور بے رحم موت نے جھنجھوڑ دیا تھا۔ اس کے دل ودماغ میں کئی دنوں تک فکر واحساس کی آندھیاں چلتی رہیں۔ اور ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے باپ کے ادھورے سپنوں کو پورا کریگا، وہ انقلاب لائے گا۔

وقت دبے پاؤں آگے بڑھتا گیا اور ارجن کی آنکھوں میں اپنے باپ کی موت

کے بعد جو انگارے دہک رہے تھے، وہ انگارے اس کی آنکھوں سے ہوتے ہوئے دل و دماغ اور جسم کے پور پور میں داخل ہو گئے۔

اس نے اپنے باپ کے اخبار ''ان تھک'' کو ایک بار پھر زندہ کیا اس کی شعلہ بار تحریروں کو جب لوگوں نے پڑھا تو انگشت بدنداں رہ گئے......سماج کے اندر پھیلی بُرائیوں، ناانصافیوں، مکّاریوں، عیاریوں اور فریبوں کے خلاف ایسی سلگتی ہوئی تحریریں...... کسی نے ایسی بے باک، بے خوف اور بے لاگ تحریروں کا تصور بھی نہیں کیا تھا، لوگوں کا ذہن تو بس سفید پوش لیڈروں، قاتلوں اور مکاروں کی مدح سرائی میں لکھی گئی تحریروں کا عادی ہو چکا تھا، لیکن جب ان تحریروں سے بالکل الگ تحریریں دیکھنے کو ملیں تو لوگ چونک پڑے...... ایک طرف جہاں لوگ ان تحریروں کی بے باکی سے متاثر ہوتے وہیں دوسری طرف چند لوگوں نے ان کا مذاق بھی اُڑانا شروع کیا، ہونہہ یہ اکیلا شخص انقلاب لانے چلا ہے۔ انقلاب تو خیر نہیں آئے گا ہاں اس کی موت ضرور آئے گی۔ طاقت ور سفید پوشوں کے آگے اس کی بساط ہی کیا ہے جو یہ ان سے لوہا لے پائے گا...... یہ بھی ایک دن اپنے باپ کی طرح موت کی بھیک مانگے گا، زندگی کے خاتمہ کے لئے گڑگڑائے گا......لیکن یہ راجن نہیں، ارجن تھا جس نے اپنی نظروں کے سامنے اپنے معصوم اور ایماندار باپ کو مایوس اور بے بسی کی موت کی گود میں ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا اور اس دن سے وہ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ اس کی رگ و پے میں انگارے سرایت کر چکے تھے۔

ارجن کی تحریروں سے جب اس کی ایک پہچان بن گئی اور لوگ اس کی تحریروں کے دیوانے ہو گئے تو اس نے ایک دن خود کو عوامی زندگی میں بھی اتار دیا۔ اور اس کی تقریریں، تحریروں سے بھی زیادہ آگ اُگلنے لگیں، جس نے بڑے بڑے ظالم حکمرانوں کے دلوں میں خوف و دہشت پیدا کر دیا۔ اس کے بڑھتے ہمنواؤں کی تعداد سے شدادوں اور نمرودوں کی نیندیں حرام ہونے لگیں اور انہیں اپنا وجود خطرے میں نظر آنے لگا۔ جن راونوں کے خلاف کوئی مُنھ کھولنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، ان کے کالے کارناموں پر آئے

دن تبصرے ہونے لگے۔ جولوگ خودکو کالے کارناموں کا بادشاہِ وقت سمجھ رہے تھے اور خوف و دہشت کا ماحول بنا کر حکمرانی کر رہے تھے، ان کی جوتیاں سیدھی کرنے والے اپنے آقاؤں پر ایسے قہر برپا ہوتے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے، جن سے ان حکمرانوں کے محلوں میں سنّاٹا چھانے لگا، ارجن نے سماج دشمنوں کے پیرا کھڑتے دیکھا تو اپنا حملہ اور تیز کر دیا۔ وہ گاؤں گاؤں شہر شہر قصبہ قصبہ گھوم گھوم کر بتانے لگا کہ یہ مٹھی بھر لوگ امن و آشتی کی فضا مسموم کئے ہوئے ہیں، ہمارے حقوق پر پہرے بیٹھائے ہوئے ہیں ہماری خاموشی، خوف اوراحساس کمتری نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے، ورنہ ہماری اتنی بڑی طاقت کے سامنے ان کا وجود بالکل بے معنی اور بے وقعت ہے، جس دن ہم ان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جائنگے' یہ لوگ بھاگ کھڑے ہوں گے۔ ہم اپنے اندر ہمّت اور جرأت پیدا کریں اور ان کے ناپاک وجود کو ختم کر دیں ہماری طاقت کے خوف سے ان کی ہوا اُکھڑنے لگی ہے۔

ارجن کی جوشیلی تقریریں اور روز بروز اس کی بڑھتی مقبولیت نے عوام کے دلوں میں امید کی کرنوں کو جگا دیا اور ہر ایک کے ہاتھوں میں سیاہ و سفید پرچم امن واحتجاج کی علامت بن کر لہرانے لگا، جسے دیکھ کر برائیوں، ناانصافیوں، ظلم وتشدد، استحصال واستبداد کے علمبرداروں کے یہاں روز بہ روز ماتم چھانے لگا۔ انہیں اپنی حکمرانی ختم ہوتی نظر آنے لگی۔

ایک دن ان سفید پوش کریہہ چہرے اور کالے دل کے لوگوں نے سر جوڑ کر ایک میٹنگ کی کہ اب پانی سر سے اوپر بہنے لگا ہے۔ حملے تیز سے تیز تر ہونے لگے ہیں۔ اس لئے اپنے وجود کی بقاء کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا، اپنی حکمرانی برقرار رکھنے کے لئے کوئی بڑا اور اہم فیصلہ کرنا ہوگا، ورنہ وہ دن دور نہیں جب ہم لوگوں کے وجود پر خطرہ منڈرانے لگے اور اس سے پہلے کہ ہمارا پورا وجود ختم ہو جائے، اس کے وجود کا خاتمہ کرنا ضروری ہے جو ہم لوگوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑا ہے۔ اس بڑے نوکیلے کانٹے کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔ دوسرے چھوٹے موٹے کانٹوں کو تو پیروں سے روند دیا جائے گا۔

............اور ایک ہفتہ بعد ہی ارجن کے ایک عوامی جلسہ میں ایک زوردار دھماکہ

ہوااور ارجن ہوا میں اُڑتا نظر آیا' اور آخری لمحے میں، جب ارجن خون سے لت پت زندگی اور موت کی درمیان کی جنگ لڑ رہا تھا، اس نے دیکھا اس کے ہزاروں ہمنوا سیاہ سفید پرچم لئے ظلم و بربریت ،قہر و جبر کے حکمرانوں کے خلاف فلک شگاف نعرے بلند کر رہے ہیں، یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ اس نے جو چنگاری پھیلائی تھی وہ آگ کی طرح پھیل چکی ہے اور ایک ارجن کے ختم ہوتے ہی ہزاروں ارجن جنم لے لیں گے اور جبر وظلم کی لہلہاتی کھیتی کو تباہ و برباد کر کے ایک نیا سماج بنائیں گے، اسے خوشی تھی کہ وہ اپنے باپ کی طرح بے بسی کی موت نہیں مر رہا ہے بلکہ ایک بہادر کی طرح موت کو گلے لگا رہا ہے اور پھر اس کا سر ڈھلک گیا اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں جامد ہوگئیں!!!

بوند بوند زندگی

خبر یقیناً حیرت انگیز اور چونکانے والی تھی۔ جس نے بھی یہ خبر سنی، ششدر رہ گیا اور دانتوں تلے انگلی دبالی......سراج احمد کو یہ بیماری؟......کیسے......؟ کہاں؟ وہ تو ایسے آدمی نہیں، پھر یہ........................

ایسی خبریں پر لگا کر اُڑتی ہیں اور جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہیں......اور یہی ہوا...... ہر کی زبان پر بس سراج احمد کی بیماری کا ذکر اور تعجب کا اظہار......

یہ خبر مجھ تک بھی پہنچی، تو میں بھی سن کر حیرت زدہ رہ گیا، یقین ہی نہیں آیا، لیکن جب کئی معتبر لوگوں نے اس کی تصدیق کردی، تو مجھے بھی یقین کرنا پڑا۔

سراج احمد کو میں کالج کے زمانے سے جانتا ہوں، وہ میرے سینئر دوستوں میں ہیں۔ خاندانی اور رئیس آدمی ہیں، ان کی شرافت اور نیکی کا ہر شخص معترف تھا۔ وہ ہر ایک سے بڑے اخلاق اور محبت سے ملتے، خوبصورت شکل وشباہت، گلابی رنگت لئے ان کا باوقار چہرہ اور اس پر ہر لمحہ پھیلی مسکراہٹ......

کالج کے دنوں میں ان سے آئے دن ملاقات رہتی اور ہر ملاقات میں وہ اپنی شخصیت کا جادو جگاتے ملتے......ایسی بھرپور اور زندگی سے معمور شخصیت سے بار بار ملنے کو جی چاہتا، لیکن جی کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے......وقت اور حالات کئی چاہتوں پر پہرے

بیٹھا دیتے ہیں...... کالج کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ صوبہ کے بڑے افسر بن گئے اور میں اپنی تجارت میں مشغول ہو گیا...... آہستہ آہستہ دوریاں بڑھتی گئیں، بس کبھی کبھار کسی تقریب یا تیوہار پر ملاقات ہوتی، تو ہم دونوں ایک دوسرے سے شکوے گلے کرتے اور دیر تک پرانی یادوں کے چراغ روشن کئے رہتے۔

ان کی بیماری کی خبر سن کر میں دوسرے ہی دن انکی رہائش گاہ پر گیا تو معلوم ہوا کہ آج ہی وہ ڈاکٹروں کے مشورہ پر ممبئی چیک اپ کے لئے گئے ہیں۔ میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔

سراج احمد ممبئی چیک اپ کے لئے گئے اور اپنے پیچھے طرح طرح کی افواہوں کا طوفان چھوڑ گئے۔ کوئی کہتا ان کی اپنی بیگم سے نہیں بنتی، جس کی وجہ سے وہ کسی دوسری عورت کی آغوش ڈھونڈتے رہے ہیں۔ کوئی بتاتا کہ آدمی کو بگڑتے دیر نہیں لگتی، جو شخص صبح سے شام تک دفتر میں حسین دوشیزاؤں کی جھرمٹ میں رہتا ہو، اس کی نیت خراب ہونے میں...... آخر وہ بھی تو انسان ہی ہیں، ضرور وہ اپنی کسی سکریٹری، ٹائپسٹ، اسٹینو یا اسسٹنٹ میں سے............ کوئی انکشاف کرتا، ارے بھائی! وہ اکثر ٹور پروگرام پر ممبئی جاتے رہے ہیں، ضرور وہیں کہیں، وہ اس مرض کا شکار ہوئے ہیں، اور کوئی سمجھاتا کہ............ غرض، جتنے مُنھ اُتنی باتیں...... میں ان باتوں کو سنتا اور دل ہی دل میں افسوس کرتا کہ اتنے باعزت اور باوقار انسان کے بارے میں اتنی گندی باتیں...... کیا وہ اس عمر میں، جبکہ ان کے بچے جوان ہو رہے ہیں، ایسی حرکت کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟...... میرے ذہن میں طرح طرح کے سوالات ڈوب اُبھر رہے تھے۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا، افواہیں پھیلتی رہیں، نفرتوں کا اظہار سراج احمد کے لئے ہوتا رہا کہ ایک دن اطلاع ملی کہ وہ ممبئی سے واپس آ گئے ہیں اور ڈاکٹروں نے حتمی طور پر اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ وہ ایڈز کے شکار ہو چکے ہیں، اور ان کی موت بہت قریب ہے۔

یہ سن کر میں کسی ہارے ہوئے پرندہ کی طرح بیٹھ گیا۔ میری نظروں کے سامنے

ان کا بارعب چہرہ، باوقار انداز گفتگو، ان کی بات بات پر کھنکتی ہنسی کی تصویریں ابھرنے لگیں......ایسی باغ و بہار شخصیت اور ایسا زندہ دل انسان کس طرح اپنی موت کا پل پل انتظار کررہا ہوگا......سوچتے سوچتے ان سے ملنے اور نہیں دیکھنے کو میں بے چین ہوا تھا اور ان کے گھر کی جانب چل پڑا۔

آدھے گھنٹے بعد میں سراج احمد کی کوٹھی کے سامنے کھڑا تھا، گیٹ کھول کر اندر احاطے میں داخل ہوا تو سامنے ہی اداس اور بے جان سا مکان نظر آیا، ایسا لگا، جیسے اچانک کسی نے اس مکان کی رونق اور زندگی کو کھرچ دیا ہو......سامنے برآمدے پر ایک نوکر نظر آیا، اُسے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو اس نے بڑی مایوسی کے عالم میں کہا کہ......''صاحب اب کسی سے نہیں ملتے ہیں'' یہ کہہ کر وہ واپسی کے لئے مڑ گیا......میں ایک لمحہ کے لئے سوچ میں پڑ گیا، کیا کروں؟ ہمت کر کے ایک بار پھر میں اس نوکر سے مخاطب ہوا اور کہا...... ''سنو! ان سے کہنا، شفیق احمد ملنے آئے ہیں، شاید وہ مل لیں''؟ میری بات سن کر نوکر اندر چلا گیا اور میں بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگا، تھوڑی ہی دیر بعد وہی نوکر اندر سے نمودار ہوا اور اس نے مجھے اندر چلنے کا شارہ کیا...... مجھے قدرے اطمینان ہوا اور خوشی بھی ہوئی کہ سراج احمد مجھ سے ملنے پر رضا مند ہو گئے...... یہ سوچتا ہوا میں نوکر کی رہنمائی میں ڈرائنگ روم اور پھر دو کمروں سے گزرتا ہوا ایک کمرہ میں پہنچا...... جہاں ایک شاندار بیڈ پر ایک نحیف اور بے جان سا شخص لیٹا ہوا تھا......میری نظریں اس شخص سے ملیں تو ایسا لگا جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو یہ...... یہ......لاغر جسم، مرجھایا چہرہ اور چہرے پر موت کا گھنا ہوتا ہوا سایہ...... یہ کون......؟ ......کیا یہ سراج احمد ہیں، وہ سراج احمد، جو کبھی............ میں تذبذب کے عالم میں تھا کہ اچانک ایک نقاہت بھری آواز ابھری......''اسلام وعلیکم''۔

میں وعلیکم سلام کہنا چاہتا تھا، لیکن مجھ پر تو جیسے سکتہ طاری تھا، میری آواز اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی، مجھے اس طرح پریشان دیکھ کر، ایک نوکر نے بیڈ کے قریب ہی پڑی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور میں دھپ سے بیٹھ گیا، اس لئے کہ میں چند لمحے مزید کھڑا رہتا تو ضرور چکرا کر گر پڑتا۔

کچھ دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے، ایسا لگا، جیسے ہم دونوں کی قوت گویائی جواب دے چکی ہے...... سوچ، فکر اور خیالات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا...... مجھ سے پہلے سراج احمد ہی اپنے جزبات پر قابو پاتے ہوئے مخاطب ہوئے......

''کیسے ہو شفیق''؟

''جی'' میں...... میں تو ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟ بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ جس کے جواب میں انہوں نے ایک مردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا......

''میں'' کیسا ہوں' یہ دیکھ ہی رہے ہو...... میرے خواب و خیال میں بھی کبھی اس بیماری کا تصور نہیں تھا...... لیکن آج میں خود اس جان لیوا بیماری کا شکار ہوں،...... اور تمہیں بتاؤں، کہ میری موجودہ حالت کی ذمہ دار اس بیماری سے زیادہ لوگوں کی نفرت اور شک و شبہ والی نظریں ہیں...... میں ان کی چبھتی نگاہوں کا سامنا کرتے کرتے ٹوٹ گیا ہوں...... میں کس کس کو بتاؤں کہ...... اچھا، تم یہ بتاؤ کہ تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا تم بھی یہی سمجھ رہے ہو جو سارے لوگ، یہاں تک کہ میری بیوی اور بچے سمجھ رہے ہیں''؟

''میں .... نہیں، نہیں، میں ایسا کیسے سمجھ سکتا ہوں، میں آپ کو ایک طویل عرصہ سے جانتا ہوں اور اس بات سے بھی بخوبی واقف ہوں کہ، آپ ایک بلند کردار کے مالک رہے ہیں،...... میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''شکر ہے کہ تم دوسروں سے الگ سوچتے ہو، ورنہ لوگ............'' انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور ان کی نگاہیں خلاء میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ چند لمحوں بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے، جیسے انہیں خلاء میں امید کا کوئی جگنو ہاتھ آ گیا ہو اور وہ اس جگنو کو مٹھی میں لے کر اپنے اردگرد کی پھیلی تاریکیوں کو روشنی میں بدل دینا چاہتے ہوں۔

''تم جانتے ہو شفیق! میں شروع سے ایک کیریکٹر والا انسان رہا ہوں، کالج کے زمانے میں کیسی کیسی حسین لڑکیاں میرے قریب آنے کی خواہش مند رہتی تھیں، لیکن میں کبھی بھی ان کی جانب متوجہ نہیں ہوا۔ شادی ہونے کے بعد اور ملازمت کی مصروفیت نے

اس جانب سوچنے کا بھی موقع نہیں دیا، میں اپنی چھوٹی سی دنیا میں بے حد خوش تھا...... پچاس سال کی عمر ہونے کو آئی، یہ عمر تو اپنے بال بچوں کی فکر کرنے کی ہوتی ہے نہ کہ بے راہ رویوں کی...... کاش یہ باتیں کوئی میری بیوی اور میرے بچوں کو سمجھا دیتا...... کہ انسان کبھی کبھی وقت اور حالات کے ہاتھوں کتنا مجبور ہوتا ہے...... میں نے ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن ان کی نگاہیں کہتی ہیں کہ وہ میری باتوں پر یقین نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے میں اب کسی سے کچھ نہیں کہتا...... مرنے کو تو میں مرجاؤں گا، لیکن غم رہ جائے گا کہ کسی نے مجھے سمجھا نہیں......

میں چونک پڑا...... آخر کیا بات ہے؟ آپ مجھے بتایئے ...... میں نے اپنائیت جتاتے ہوئے اُن کے دل میں داخل ہونے کی کوشش کی اور ایک لمحہ توقف کے بعد وہ دھیرے دھیرے بولے...... ''تم تو اس بات سے واقف ہو کہ میں دفتر کے کام سے اکثر ٹور پروگرام پر ممبئی جاتا رہتا تھا......''

''ہاں' ہاں' اچھی طرح جانتا ہوں'' میں نے کہا اور سوچنے لگا' اب یہ ضرور ممبئی میں ہونے والے کسی خوشگوار حادثہ کا ذکر کریں گے۔

میرے جواب پر توجہ دیئے بغیر، انہوں نے اپنی بات جاری رکھی...... ''وہاں کی بھاگ دوڑ کی زندگی سے بھی تم واقف ہو' گذشتہ سال فروری میں بھی گیا تھا' ایک روز میں دفتر سے نکل کر ایک سڑک پار کر رہا تھا' کہ اچانک ایک تیز رفتار کار نے مجھے ٹکر ماردی' میں زخمی ہوکر گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔

ہوش آیا' تو دیکھا' میں ایک نرسنگ ہوم میں ہوں...... بعد میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ میرے جسم سے کافی خون نکل چکا تھا' اس لئے کئی بوتل خون چڑھانا پڑا......اور یہیں سے میری بربادی کی ابتدا ہوتی ہے...... دراصل بلڈ بینک کا جو خون میرے جسم میں داخل کرایا گیا' ان میں سے کوئی ایک بوتل کسی ایڈس کے مریض کا خون تھا' جو میرے جسم میں دوڑنے لگا' جس نے مجھے اس جان لیوا مرض کا شکار بنا دیا...... بعد میں ڈاکٹروں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا' لیکن اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی......اس خون نے نہ صرف میری زندگی

مختصر کر دی' بلکہ لوگوں کی نفرت اور شک وشبہات سے بھری نگاہوں نے مجھے اتنے زخم دیئے کہ میں ان زخموں سے چور چور ہو گیا ہوں......اور اب......اب تو بس مجھے موت کا انتظار ہے' کسی بھی لمحہ...... کسی بھی پل...... میں تم لوگوں سے دور...... بہت دور چلا جاؤں گا......

اچانک ان کی آواز غموں کے اتھاہ سمندر میں کہیں ڈوب گئی......''

میں ان کے رُندھے گلے اور ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھ کر بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا' اور بے اختیار میرا ہاتھ ان کے سر کو سہلانے لگا۔

''آپ کا یہ بیان یقیناً دردناک ہے' ایسا لگتا ہے' آپ نہیں' ہم سب بیمار ہیں' جو آپ کے بارے میں ایسا ویسا سوچ رہے ہیں''

میں یہ کہتا ہوا' ان کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو خشک کرنے کی کوشش کرنے لگا!

☆☆☆☆☆

رشتہ نیند کا

اچانک وہ بہت اداس ہو گیا۔

حالانکہ اس دن کے آنے کا اُسے برسوں سے انتظار تھا۔ اسی دن کے لئے تو اس نے نہ جانے کتنے سپنے دیکھے تھے۔

اس کا پورا گھر قمقموں سے سجا تھا۔ شادیانے کی گونج ہر سمت تھی۔ ڈھولک کی تھاپ پر عورتوں نے سہاگ کے گیت چھیڑ رکھے تھے۔ اور اس کا پیارا اور جان سے بھی زیادہ عزیز بیٹا قیس دولہا بنا بیٹھا تھا۔

رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ قیس کی بارات لے کر گیا۔ عقد کے بعد وہ مبارک باد دینے والوں کے درمیان گھر گیا، کسی سے وہ گلے ملا، کسی سے ہاتھ ملایا، پھولوں کے کئی ہار بھی اس کے گلے میں پڑے تھے اور وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ لوگوں سے ملتا، مبارک بادیاں قبول کرتا، ہاتھ ملاتا ہوا وہ آگے بڑھا اور اپنے بیٹے قیس کو گلے لگا لیا۔ ایسی راحت۔ ایسا سکون۔ ایسی مسرّت کا احساس شاید اسے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ بیٹے کو وہ گلے لگا کر جزبات سے مغلوب ہو گیا اور اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکلنے لگے۔

جسے اس نے آہستہ سے اپنی آستین میں جذب کرلیا۔

دوسری صبح کئی رسومات کی ادائیگی کے بعد بارات اور دلہن کو لے کر وہ خوشی خوشی گھر لوٹا۔ دلہن کی خوبصورتی کا وہ ذکر سن چکا تھا۔ اس لئے اس نے تھوڑی ہی دیر بعد دلہن کو اپنے کمرے میں بلوایا، دلہن سمٹی سمٹی، شرماتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور نگاہیں جھکائے کھڑی رہی' اس نے دلہن کو دعائیں دیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی جانب سے ایک بے حد خوبصورت سونے کا جڑاؤ سیٹ تحفہ دیا۔ تحفہ لیتے وقت دلہن نے نظریں اٹھائیں' تو اس نے اسے غور سے دیکھا۔ دلہن واقعی بہت حسین نازک اور سبک سی تھی۔ اسے خوشی ہوئی کہ وہ قیس کے لئے بے حد خوبصورت دلہن لانے میں کامیاب رہا...... تحفہ لے کر دلہن مئودبانہ آداب کہتی ہوئی واپسی کے لئے مڑ گئی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر اس کی نظروں کے سامنے ماضی کے گزرے ہوئے واقعات جھلملانے لگے۔

قیس نے بہت دکھ اٹھایا ہے۔ گرچہ اس نے اس کے دکھ کے احساس کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ لیکن جب کبھی وہ تنہائی میں بیٹھ کر آنسو بہاتا نظر آتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کا کلیجہ شق ہو جائیگا۔ وہ قیس کو اپنے سینے سے لگا لیتا، اسے سمجھانے کی کوشش کرتا، میں ہوں نہ بیٹا، میں تو تمہارا باپ بھی ہوں، ماں بھی ہوں، بھائی بھی ہوں، بہن بھی ہوں' تم خود کو تنہا کیوں محسوس کرتے ہو۔

اس کی ماں اُس وقت ابدی نیند سو گئی تھی۔ جس وقت قیس کی ننھی سی جان کو تھپکیاں دے دے کر اور لوری سنا سنا کر سلانے کا وقت تھا۔ وہ اس وقت صرف دو سال کا تھا، جب اس سے اس کی ممتا بھری گود چھن گئی تھی۔ وہ آج بھی اس قیامت خیز منظر کو نہیں بھول پایا تھا، جب قیس اپنی مردہ ماں کے جسم سے لپٹا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اور ممتا کے خشک ہو گئے سوتے سے اپنی بھوک مٹانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی ماں تو ابدی نیند سو چکی تھی۔

اس کے اندر جب کوئی جنبش نہیں ہوئی تو قیس کے رونے اور چیخنے کی صدا بڑھتی گئی۔ اور آخر کار اس نے اسے گود میں اُٹھالیا، اُسے تھپکیاں دیں، پیار کیا، سینے سے لگایا، پھر بھی وہ روئے جا رہے تھا۔ اور روتے روتے وہ نڈھال ہو کر سو گیا اور اسی درمیان اس کی ماں گھر سے لوگوں کے کاندھوں پر رخصت ہوگئی۔

اُسی رات سے ہی اس نے قیس کو اپنے سینے سے لگا کر ساتھ سلانے کی عادت لگائی۔ اور پھر جوان ہونے کے بعد بھی وہ اسی کے ساتھ ہی سوتا رہا...... حالانکہ جس وقت اس کی بیوی کا انتقال ہوا تھا، اس وقت وہ بالکل نوجوان تھا۔ صرف تین سال ہی تو ہوئے تھے اس کی شادی ہوئے۔ لیکن اس نے اپنے بچے کی خاطر اپنی زندگی تج دی تھی۔ جوانی کو بوڑھاپے میں بدل لیا اور فرض کی چادر اوڑھ لی تھی۔ ہر پل، ہر لمحہ وہ قیس کے لئے فکرمند رہتا، رات میں جب تک وہ اسے خوب پیار نہیں کرتا، اسے اپنے سینے سے نہیں لگاتا، اسے نیند ہی نہیں آتی۔ قیس جب جوان ہوگیا تو لوگوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اب وہ جوان ہوگیا ہے اسے الگ سلاؤ، اچھا نہیں لگتا ہے۔ لیکن وہ لوگوں کی ان باتوں کی پرواہ کئے بغیر ہمشہ اسے اپنے ساتھ ہی سُلاتا رہا، جوان بیٹے کو وہ اب اس طرح سے پیار تو نہیں کر پاتا، جس طرح وہ بچپن میں پیار کرتا تھا۔ لیکن بیٹا جب گہری نیند سو جاتا تو وہ اس کی پیشانی کو چومتا، اس کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سہلاتا، اس کی پیٹھ کو تھپکیاں دیتا...... قیس بھی ایسے پیار کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ ایسے لمحوں میں بڑی گہری نیند سویا ہوتا...... کبھی کبھی اسے لگتا کہ قیس اتنا جلدی جوان کیوں ہوگیا، وہ اسی طرح چھوٹا رہتا تو وہ پہلے ہی کی طرح اپنے سینے پر لیٹا کر تھپکیاں دے دے کر سلاتا...... وہ ماضی کے دھند لکے میں کھویا ہی رہتا کہ اچانک اسے کسی نے آواز دی اور وہ خیالوں کی دنیا سے واپس آ گیا......!

شادی دونوں باپ بیٹے کے لئے زندگی کا ایک اہم موڑ بن گی تھی وہ شائد پہلی رات تھی جب وہ دونوں الگ الگ ہوئے تھے بیٹا پھولوں کی سیج پر اپنی نئی نویلی دلہن کے

ساتھ اور باپ......اسے رات گئے تک نیند ہی نہیں آئی۔ رہ رہ کر اسے قیس کی کمی کا احساس ستا تا رہا، اس رات اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے نرم نرم بستر پر کانٹے ہی کانٹے اُگ آئے ہوں۔ پل بھر کے لئے ہلکی سی نیند آتی تو اس کا ہاتھ بے اختیار قیس کو تلاش کرنے لگتا اور اسے جب وہ نہیں ملتا تو اس کی آنکھیں کھل جاتیں...... پھر وہ کروٹ پر کروٹ بدلنے لگتا۔ بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت میں صبح ہو گئی اور دن بھر اس کے اوپر جھنجھلاہٹ سوار رہی۔ کسی کام میں اس کا دل نہیں لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی کوئی قیمتی شئے گم ہو گئی ہو۔ پورے ۲۴ برس تک وہ جس جسم کو اپنے سینے سے لگائے رہا، محبت اور شفقت کی بارش کرتا رہا' اب وہ جسم' اس کے قریب رہ کر بھی اس سے کس قدر دور ہے۔

اور ایک رات،............وہ رات بہت بھیانک اور سیاہ رات تھی۔ وہ بہت ہی تنہائی محسوس کر رہا تھا، پاس کے کمرے سے قیس اور اس کی دلہن کی کبھی دھیمی اور کبھی قہقہے کی آوازیں آ رہی تھیں اور اس کے بستر پر تو کانٹے ہی کانٹے بکھرے تھے۔ اس نے گزشتہ کئی راتوں کی طرح اس رات بھی سونے کی ہر ممکن کوشش کی' لیکن نیند کی دیوی، اسے اپنی آغوش میں لینے کو تیار ہی نہیں تھی دیوار گھڑی نے رات کے دو بجنے کا اعلان کیا اور وہ بے چین اور بے قرار ہو کر ٹہلتے ٹہلتے رک گیا' اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں لرز رہی تھیں، اچانک اس کی آنکھیں قیس کے کمرہ کے دروازے پر جم گئیں اور پھر اس کے بھاری قدم اٹھنے لگے، وہ بے آواز چلتا ہوا قیس کے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ قیس اپنی بیوی سے لپٹا ہوا بے خبر سو رہا تھا۔ یہ منظر اسے عجیب سا لگا۔ جس سینے پر ہمیشہ اس کے شفقت بھرے ہاتھ ہوتے تھے، آج اس سینے پر دلہن کے بے حد خوبصورت اور مہندی رچے ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں اس وقت دلہن کے وہ ہاتھ اسے بہت بدنما لگے، قیس کے دھڑکتے سینے پر یہ اجنبی ہاتھ؟ یہ ہاتھ کیوں؟ اور اچانک نہ جانے کیا ہوا اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا اس نے اپنے جسم کے اندر ایک جھرجھری سی

محسوس کی اور وہ بڑی خاموشی سے آگے بڑھا اور دلہن کے قریب پہنچ گیا' جو دنیا اور مافیہا سے بے خبر خوبصورت وادیوں میں سیر کر رہی تھی۔ دلہن کے ہاتھ جو قیس کے جسم پر تھے، اُسے آہستہ سے الگ کیا پھر اس نے گہری نیند سو رہی دلہن کو قیس سے الگ کیا اور وہ جیسے ہی الگ ہوئی اس نے اس کی ناک اور منہ پر بھرپور طاقت سے اپنے مضبوط ہاتھ رکھ دیا۔ دلہن کا دم گھٹنے لگا۔ اس کا جسم چھٹپٹانے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور وہ بے حس و حرکت ہو گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ دلہن کو کنارے کیا پھر اور جس جگہ وہ سوئی ہوئی تھی، ٹھیک اسی جگہ وہ لیٹ گیا اور اپنے ہاتھ قیس کے جسم پر اس اعتماد کے ساتھ رکھ دیا' جیسے اس پر صرف اس کا حق ہے......اور چند ساعتوں بعد اسے گہری بہت گہری نیند آ گئی!

دردگنگا کا

آخر کار ایک دن گنگا سے میری ملاقات ہو ہی گئی، بہت دنوں سے میں اس سے ملنے کو بے چین تھا۔ اس کی خوبصورتی اس کی مدہوش ادائیں اس کی شوخیاں اس کا بانکپن اس کی مترنم آواز کے چرچے اس قدر مشہور تھے کہ اکثر میرے دل میں اس سے ملنے کی خواہش انگڑائیاں لیتی رہتی تھیں اور ایک دن مجھے موقع مل گیا اور میں خوشی خوشی گنگا کے قریب بہت قریب پہنچا، لیکن یہ کیا یہ گنگا اس قدر اُداس، خاموش اور بجھی بجھی سی کیوں ہے؟ یہ گنگا کیا یہ وہی گنگا ہے جو ہمیشہ موج مستی سے سرشار رہا کرتی تھی کبھی یہاں، کبھی وہاں اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی تھی، اپنی مدھر سرگوشیوں سے اپنے قریب آنے والوں کے دلوں کو موہ لیتی تھی، جس نے بھی اس کی قربت پائی وہ اس کی طغیانی دیکھ کر مدہوش ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا اور ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی کہ جتنی دیر بھی ممکن ہو وہ اس کی آغوش میں رہے تا کہ اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل و دماغ کو سکون ملتا رہے۔

لیکن یہ گنگا تو بجھ سی گئی تھی اس کا اب وہ پہلے جیسا صاف و شفاف چہرہ تھا نہ ہی اس کی چال میں وہ مدہوشی تھی، اس کی آواز میں وہ ترنم بھی نہیں تھا اس کے وجود سے نکلنے والی وہ بھینی بھینی خوشبو بھی نہیں تھی پھر بھی گنگا سامنے تھی...... جو بہت اداس، غمگین اور پژمردہ تھی...... اس کی اس حالت کو دیکھکر میں بھی غم میں ڈوب گیا...... بڑی چاہت اور اُمنگ

کے ساتھ اس سے ملنے میں آیا تھا......لیکن میرے سارے جذبات سرد پڑ گئے۔

اسے اس طرح اُداس، اور خاموش دیکھ کر میں اس کے قریب چپ چاپ کھڑا رہا، میری زبان پر جیسے کسی نے قفل ڈال دیا ہو، میری آنکھوں کی جیسے کسی نے رونق چھین لی ہو...... بہت دیر کی خاموشی جب بوجھل ہونے لگی، تب میرے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا اور بڑی ہمت جُٹا کر گنگا سے سوال کیا" کیا بات ہے گنگا تم اتنی اُداس اور خاموش کیوں ہو"؟

جواب میں گنگا اپنی خاموش اور بے جان نگاہوں سے مجھے تکنے لگی' ایسا لگا جیسے اپنی اداسی کی وجہ بتانے کے لئے وہ کوئی سرا ڈھونڈھ رہی ہو اور اسے کوئی سرا نہیں مل رہا ہے۔

چند ساعتوں بعد اس نے اپنی بے قرار خاموشی کو توڑا۔"تم......میری اُداسی کی وجہ جاننا چاہتے ہو...... میں تمہیں ضرور بتاؤں گی' مجھے خوشی ہے کہ کوئی تو میرا حال جاننے آیا ورنہ اب تو لوگ صرف میرے وجود کو پامال کرنے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔تم ایسا کرو، اس وقت تم واپس جاؤ' شام ڈھلنے کے بعد میرے پاس آنا، تمہیں میری خاموشی اور اُداسی کی وجہ معلوم ہو جائے گی۔

اور......میں اس کی بات مان کر لوٹ گیا......لیکن سارا دن تجسس میرا پیچھا کرتا رہا......گنگا نے مجھے شام ڈھلنے کے بعد کیوں بلایا ہے......کیوں؟ کیوں؟

اور......اس کیوں کا جواب پانے کے لئے میں شام ڈھلنے سے قبل ہی گنگا کے قریب پہنچ گیا......

اس وقت گنگا کچھ زیادہ ہی اُداس اور بجھی بجھی معلوم ہوئی......

میں جیسے ہی گنگا کے قریب پہنچا، گنگا نے مجھے بے نور نگاہوں سے دیکھا اور بے حد دھیمی آواز میں بولی...... "تمہیں جواب مل جائیگا" بس تم اُس کنارے پیڑ کے پیچھے چھپ جاؤ......

گنگا کی درد و غم میں ڈوبی ہوئی یہ آواز......ایسا لگ رہا تھا جیسے دور بہت دور سے آرہی ہو اور اس کی ہر آواز کسی چٹان سے ٹکرا کر لوٹ رہی ہو......

اچانک اس جگہ کی خاموشی کو توڑتی ہوئی چند لوگوں کے قدموں کی آواز سنائی دی اور میں تیز قدموں سے دوڑتا ہوا ایک پیڑ کے پیچھے چھپ گیا۔لوگ بڑی تیزی سے آرہے

تھے، چار چھ لوگ ہو نگے اوران لوگوں کے کاندھوں پر ایک ارتھی تھی۔

میں حیرت سے دیکھنے لگا جو لوگ ارتھی اُٹھائے تھے، ان کے چہرے پر مجرمانہ خاموشی تھی۔ ایسا کیوں؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک زوردار چھپاک کی آواز اُبھری اور پھر ڈوبتی چلی گئی۔ میں نے دیکھا وہ ارتھی گنگا کی آغوش میں تھی اور گنگا اسے تھپکیاں دے رہی ہے اور اسے لانے والے بڑی تیزی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

میں بھی اسی تیزی سے پیڑ کے پیچھے سے نکلا اور گنگا کے قریب پہنچا۔

گنگا میرے سوال پوچھنے سے قبل ہی بول پڑی...... دیکھو میری آغوش میں یہ ایک بے حد غریب انسان کی لاش پڑی ہے...... یہ بیمار پڑا، لیکن اس کے لواحقین کے پاس اس کے علاج کے لئے پیسے نہیں تھے، ڈاکٹروں نے جب اسے مرتا دیکھا تو اس کے جسم کے قیمتی اعضاء نکال کے فروخت کر دیا اور یہ جو لوگ اسے لے کر آئے تھے، وہ اس شخص کے انتم سنسکار کے پیسے لے کر بھی اسے انتم سنسکار کے لائق نہیں سمجھا اور میری آغوش میں پھینک گئے۔ اور......اور......

ابھی گنگا کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اندھیرے کا سینہ چیرتی ہوئی نرسنگ ہوم کی ایمبولینس گاڑی قریب آ کر رکی۔ اس کے اندر سے دو شخص باہر نکلے، دونوں کے ہاتھوں میں کئی چھوٹی چھوٹی گٹھریاں تھیں۔ دونوں آگے بڑھے اور چھپاک...... چھپاک کی کئی آوازیں، سناٹے میں چیخ بن کر ابھریں اور پھر خاموشی گہری خاموشی چھا گئی۔ گاڑی واپس چلی گئی...... میں پھر بھاگا بھاگا گنگا کے قریب گیا...... گنگا اپنے آنچل میں سفید کپڑوں میں بندھی کئی گٹھریوں کو لئے آنسو بہار ہی تھی۔

''ارے گنگا...... تم تو رو رہی ہو، کیا بات ہے......'' گنگا بڑی دیر تک سسکتی رہی اور کچھ دیر بعد بڑی مشکلوں سے خود پر قابو پاتے ہوئے بولی......

''روؤں نہیں تو اور کیا...... دیکھو آج کے یہ انسان کس قدر حیوان بن گئے ہیں، جانوروں کے اندر بھی اتنی بے رحمی نہیں، جتنی آج کے زمانے میں انسانوں کے اندر بے رحمی اور بے حیائی سراعت کر چکی ہے''۔

''کیوں کیا ہوا؟ تم اس قدر جزباتی کیوں ہو رہی ہو گنگا''؟

''دیکھو ان گٹھریوں کو ان میں وہ معصوم مردہ بچیاں ہیں جنہیں کھلنے سے قبل ہی

مَسل دیا گیا......آج کے زمانے میں لڑکیوں سے اتنی نفرت ہوگئی ہے کہ اپنے ہی ماں، باپ، پیدا ہونے سے قبل یا پیدا ہوتے ہی اسے ہلاک کر دیتے ہیں اور یہاں میری پناہ میں ڈال جاتے ہیں......دیکھو دیکھو اُن گٹھریوں کو یہ ان بچوں کی لاشیں ہیں جو ناجائز رشتے کے انجام ہیں......اور اپنے خون، اپنے وجود کے معصوم کومل اور پیارے پیارے انگ کو بھی اپنانے کی جرائت نہیں رکھتے اور اپنے بے رحم ہاتھوں سے مار کر میرے پاس پھینکوا جاتے ہیں۔ اکثر کوڑے کے ساتھ بھی ایسے بچے کپڑوں میں لپٹے میری آغوش میں آتے ہیں...... میں ایسے لوگوں کے گناہوں کو کس قدر پناہ دوں، ان پر کتنا پردہ ڈالوں......لوگوں کے دلوں کے اندر کی اور چہروں پر پڑنے والی برائیوں کے پرتو کو کتنا دھوتی رہوں، مشکل تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے اور اب تو میرا وجود اور میرے وجود کا آنچل چھوٹا ہونے لگا ہے۔

یہی وہ المناک' اذیت ناک اور کربناک حالات ہیں جس نے میری ساری خوشیاں، جولانی، تغیانی اور میرے حسن و جوانی کو چھین لیا ہے......میری شادابی میرا التقدس بھی ماند پڑنے لگا ہے۔ لیکن میرے اس کرب اور اذیت کو کوئی سمجھنے والا نہیں ....اور یہ کہتی ہوئی وہ سسکیاں لینے لگی۔

میں نے اِسے سمجھانے کی بہت کوشش کی......تم واقعی مہان ہوگنگا، جو سارے زمانے کی کثافتوں کو اپنے وجود میں سموئے لے رہی ہو اور تمہیں تو اس بات پر خوش ہونا چاہئے کہ......

مجھے اپنے ختم ہوتے وجود اور اپنی ماند پڑتی شادابی کی فکر نہیں' مجھے تو اس بات کا غم ہے کہ جو لوگ مجھے امرت سمجھ کر ہونٹوں سے لگاتے ہیں' ان کے لئے میں کہیں وِش نہ بن جاؤں۔!!

☆☆☆☆☆

دستک رشتوں کی

شہر کی فضا اچانک کشیدہ ہوگئی۔
سبب معلوم کرنے پر پتا چلا کہ کالج سے رکشہ پر لوٹتی ہوئی ایک لڑکی کو چند غنڈوں نے زبردستی اتارا اور کار میں بیٹھالیا، وہاں پر موجود لوگ لڑکی کی چیخ و پکار سن کر دوڑے اور اس ناز یبا حرکت کو روکنے کی کوشش کی، لیکن غنڈوں نے ان کی جم کر پٹائی کی اور بہت تیزی سے کار کو بھگاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

لڑکی کو اغواء کرنے والے شہر کے ایک دبنگ سیاست داں کے گُرگے تھے۔
لڑکی کو اغواء کرنے کی خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور دیکھتے دیکھتے کئی گروپ آمنے سامنے ہوگئے پتھراؤ، بموں کے دھماکے اور بندوق کی گولیوں کی آواز سے شہر کی اچھی خاصی فضا مکدر ہوگئی۔ ضلع انتظامیہ فوراً حرکت میں آ گیا اور حتی المکان معاملہ کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی دونوں طرف کی بھیڑ کو منتشر کرنے کے لئے آنسو گیس چھوڑے گئے، لاٹھی چارج کیا گیا اور ضلع انتظامیہ نے یہ وعدہ کیا کہ بہت جلد لڑکی کو برآمد کرلیا جائے گا۔

میں دفتر سے عموماً شام کے وقت گھر ہی لوٹتا تھا، لیکن ان دنوں میری بیوی مہ ناز

اپنے تینوں بچوں کے اسکول میں گرمی کی تعطیل ہو جانے کے سبب حسب پروگرام اپنی مائکے چلی گئی تھیں اس لئے دفتر سے نکل کر میں اپنے دیرینہ دوست رمیش یا جیسوال کے گھر چلا جاتا، شام کی چائے پیتا ٹی وی پر خبریں اور کوئی سیریئل دیکھتا اور ان کی پتنیوں کے اصرار پر کھانا کھا کر ہی لوٹتا۔

لیکن آج یہ سوچ کر کہ ممکن ہے شہر کے حالات مزید بگڑ جائیں اور گھر واپسی میں دشواری ہو، میں دفتر سے سیدھا اپنے گھر لوٹ آیا، گھر لوٹتے لوٹتے شام کا دھندھلکا گہرا ہو گیا تھا اور تاریکی پھیلنے لگی تھی، اپنی کالونی میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہوا کہ لوگ سراسیمہ ہیں جگہ جگہ کئی کئی ٹولیوں میں لوگ کھڑے تھے اور آج کے ناخوشگوار واقعہ پر اپنے اپنے طور پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ایک جگہ ایسے نوجوانوں کی ٹولی کھڑی تھی جو بے حد مشتعل نظر آرہے تھے، معاملہ ایک لڑکی کا تھا اس لئے فطری طور پر سبھوں کی ہمدردی اس کے ساتھ تھی۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ضلع انتظامیہ نے وعدہ کیا ہے، وہ بہت جلد لڑکی کو برآمد کر لینگے۔

میری یہ بات سن کر، کئی لڑکے، جو عام طور پر میرا احترام کرتے تھے، مجھ سے الجھ پڑے۔

''برآمد کر لینگے؟ کس حالت میں برآمد کر لینگے؟ کیا ہماری کوئی عزت نہیں ہے، وہ اکثریت میں ہیں تو اس کا کیا مطلب ہے، کہ وہ لوگ ہماری بہو، بیٹی کو اٹھا کر لے جائینگے، ان کی عزت اور عصمت سے کھیلینگے اور ہم لوگ بس تماشائی بنے رہیں، ہے نا...... آپ جیسے لوگوں کی اسی خاموشی اور بزدلی ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ............''

نوجوانوں کی بات ابھی کچھ اور آگے بڑھتی کہ اچانک سامنے سے ایک پیٹرولنگ پولیس جیپ آتی دیکھ کر، وہ نوجوان بڑی تیزی سے ایک گلی میں داخل ہو گئے اور میں بھی تیز تیز قدموں سے اپنی گلی میں چلا آیا اور اپنے مکان کا صدر دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

فریش ہو کر میں نے ٹی۔ وی آن کر دیا...... خبروں اور تبصروں کا دور چل رہا تھا۔ رات کے آٹھ بجنے والے تھے، لوکل چینل پر خبریں آنے لگیں، آج کے حادثہ کی تفصیل

بتاتے بتاتے اناؤنسر نے شہر کے ضلع انتظامیہ کے حوالے سے بتایا کہ افواہوں کا بازار گرم ہے، حالات کشیدہ ہوتے جارہے ہیں، جگہ جگہ آپسی جھڑپوں کی بھی خبریں ہیں، اس لئے کوئی بڑا حادثہ ہو، اس لئے احتیاط کے طور پر آج رات آٹھ بجے سے کل صبح آٹھ بجے تک کے لئے کرفیو نافذ کردیا گیا ہے۔

لوکل نیوز جیسے ہی ختم ہوتی، میں نے ٹی۔وی۔آف کردیا۔دل کو ایک اطمینان ہوا کہ اب حالات مذید نہیں بگڑینگے کل صبح تک حالات معمول پر آجائیں گے۔

یہ سوچتے ہوئے میں نے فریز سے کچھ کھانے پینے کا سامان نکالا اور ریڈیو کا ایف ایم بینڈ آن کر دیا اس وقت پرانے گانوں کا وقت ہوتا ہے، جو مجھے بہت پسند ہے، میں نے کھانا کھا کر چائے بنائی اور چائے کی پیالی لئے ہوئے اپنے بیڈروم میں داخل ہوا اور چائے کی پہلی چسکی لی ہی تھی کہ ریڈیو سے لتا منگیشکر کا ایک دل کو تڑپا دینے والا گانا......"کبھی تنہائیوں میں ...... ہماری یاد آئے گی......شروع ہو گیا۔

یہ گانا میں جب بھی سنتا ہوں ایسا لگتا ہے جیسے یہ گانا لتا نہیں، بلکہ میری پُرانے دنوں کی محبوبہ اوشا گا رہی ہے، بلکہ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس گانے کی صدا وہ مجھ تک پہنچانا چاہتی ہے، اس سے قبل بھی کئی بار یہ گانا میری سماعت سے ٹکرایا تھا اور میں ذہن کو جھٹک کر ریڈیو بند کر دیتا اور اپنی بے حد محبت کرنے والی بیوی کے پاس آجاتا اور اس کی قربت پاتے ہی میں وہ سب کچھ بھول جاتا جو اس گانے کو سننے کے بعد پرانی یادیں طوفان بن کر میرے احساسات وجذبات کو متذلذل کر دیتے تھے۔

لیکن آج میرے پورے گھر میں تنہائیوں کی حکمرانی تھی بیوی بچوں کی عدم موجودگی سے پورا گھر خاموش اداس اداس سا لگ رہا تھا اور ایسے لمحے میں اوشا کی یہ صدا...... میں نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دی اور اس گانے میں ڈوبتا چلا گیا، اوشا کے ساتھ بتائے ہوئے خوشگوار لمحوں کی یادوں کے ایک ایک چراغ روشن ہونے لگے، آج نہ جانے کیوں، میں نے ریڈیو بند کیا اور نہ ہی یادوں کے روشن ہوتے چراغوں کو بجھانے کی

کوشش کی..... یادیں' برسات کی پہلی ہلکی بارش کی پھوار کی طرح میرے روم روم میں ایک عجیب سی لذت جگانے لگیں۔ میں بے خود ہوتا چلا گیا اور اسی بے خودی کے عالم میں گانا ختم ہوتے ہی میں نے اپنا کمپیوٹر آن کر دیا اور ایک خاص پاس ورڈ دے کر اپنا ایک مخصوص اور رازدار ویب سائٹ کھولا..... نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا' جب میں نے اپنے چند پرانے دوستوں کے کئی اہم خطوط اور تصویروں کے ساتھ ساتھ اوشا کے بھی لکھے ہوئے خطوط اور اس کی کئی تصویروں کو فائل کر دیا تھا۔

ویب سائٹ کھلتے ہی اوشا کی ایک بے حد دل آویز مسکراہٹ بھری تصویر سامنے آ گئی' میں اسے دیکھتا رہا' بہت دیر تک دیکھتا رہا، اس کی شوخیاں، چلبلا پن، اس کی دوشیزگی، اس کا الہڑ پن، اس کی ایک ایک باتیں، اس کا روٹھنا، اس کا منانا..........تصویر دیکھتے دیکھتے میری آنکھوں سے سیلاب اُمڈ آیا، آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں نے میرا چشمہ بھگو دیا، میں نے چشمہ اُتارا اسے رومال سے صاف کیا اور پھر آنکھوں پر چڑھایا...... ماؤس کو حرکت دی تو اوشا کی ایک دوسری تصویر سامنے آ گئی، اس تصویر میں وہ کس قدر خوبصورت دلآویز اور چنچل لگ رہی تھی......تصویر ایسی تھی، جیسے وہ اب بس بول پڑے گی.......... یہ تمام تصویریں اوشا نے خاص طور پر میرے لئے کھینچوائی تھی، اس لئے ہر تصویر میں وہ اپنے جسم اور آنکھوں سے بس مجھ سے مخاطب تھی۔ اور پھر......وہ تصویر سامنے آ گئی، جسے دیکھ کر میں لرز اُٹھا' اس تصویر میں اوشا تھی اور اس کی گود میں دس بارہ ماہ کا ایک بے حد پیارا معصوم بھولا بھالا اور پھولوں کی طرح شاداب کھلا ہوا بچہ ہے، یہ بچہ...... یہ بچہ دراصل اوشا اور میری محبت کی نشانی ہے اور اس راز سے صرف ہم دونوں ہی واقف ہیں ورنہ ساری دنیا یہ جانتی ہے کہ یہ بچہ اوشا اور اس کے شوہر منوہر کا ہے۔ اس بچے کا نام اوشا میرے نام جیسا رکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے اس کا نام منجو رکھا تھا، بعد میں اوشا نے اپنے شوہر سے بھی خوبصورت بہانا بنا کر اس نام کی رضامندی لے لی تھی......اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی اور میں اپنے منجو کو دیکھنے، اس سے ملنے اور اسے سینے سے لگانے کے لئے تڑپتا رہتا

تھا، کبھی کبھی میں اس قدر جزباتی ہو جاتا تھا کہ میری خواہش ہوتی کہ راز کی ساری حدوں کو پھلانگ دوں، ساری دیواروں کو توڑ دوں اور دنیا کو چیخ چیخ کر یہ بتا دوں کہ نجو میرا بیٹا ہے، میں ہی اس کا باپ ہوں..........

لیکن ایسا کرنے کے بعد' اوشا کی زندگی ....؟ جسے اس نے میرے بہت سمجھانے بجھانے پر بسائی تھی، اور ٹھیک اس وقت وہ شادی کے لئے رضامند ہوئی تھی جب اس نے میرے جذباتی محبت کے گوہر کو پا کر گلو سوز ہوئی تھی اس کی پُر بہار زندگی پت جھڑ میں بدل جاتی اور میں ایسا کسی بھی حال میں نہیں چاہتا تھا، یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں نے وقت اور حالات کے آگے سپر ڈال دی اور میں بھی مہہ ناز کا ہو کر، اوشا کی زندگی سے دور بہت دور نکل آیا اور کوشش کی کہ اپنی ان یادوں کو دل سے کھرچ کر نکال دوں اور میں اس میں کامیاب بھی ہو گیا، بس کبھی کبھی نجو کی کسک ایک ٹیس بن کر ابھرتی، لیکن دھیرے دھیرے میں نے اسے بھی فراموش کر دیا تھا۔

اچانک غیر ارادی طور پر ماؤس پر میری انگلی کی حرکت سے کمپیوٹر اسکرین پر نجو کی دوسری تصویر سامنے آگئی، اس تصویر میں وہ تقریباً پانچ سال کا تھا، بے حد چلبلا، شریر سا اور بہت غور سے دیکھنے کے بعد اس کے چہرے کے نقوش پر میرے چہرے کی پرچھائیاں رقص کرتی نظر آئیں، میں جزبات سے بھر گیا اور بے اختیار میرا ہاتھ اس کے چہرے کو چھونے کو بڑھا، لیکن میرا ہاتھ کمپیوٹر کے اسکرین سے ٹکرا کر رہ گیا اور میں مایوس ہو گیا...... میں اپنے بچے کو چھو نہیں سکتا، دیکھ نہیں سکتا، پیار نہیں کر سکتا...... اس سے بڑھ کر میرا المیہ کیا ہو سکتا ہے...... اس تصویر کے بعد اوشا نے اس کی کوئی تصویر نہیں بھیجی اور شائد وہ اپنی گھر گرہستی میں گم ہو گئی تھی، اور یہ اچھا ہی ہوا' میں بھی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ان دونوں کے وجود کو فراموش کر چکا تھا...... ہاں ایک دن جب میں دفتر کے کام سے دفتر کی کار سے فلائی اور سے گزر رہا تھا کہ اچانک ٹریفک جام ہو گیا اور میری کار کے ٹھیک پاس میں ایک کار لمحے بھر کے لئے رکی تو دیکھا کار کی پچھلی سیٹ پر اوشا بیٹھی تھی اور اس کے بغل میں ایک سترہ اٹھارہ سال

کا ایک نو جوان تھا مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اوشا کے ساتھ یہ لڑکا سنجو ہے، میں نے چونک کر دیکھا، اوشا بھی چونکی، لیکن ٹھیک اسی وقت ٹریفک رواں دواں ہو گیا اور اس کی کار فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی۔

سنجو کو دیکھے ہوئے کئی سال ہو گئے، اب تو وہ تقریباً بیس سال کا نوجوان ہو گیا ہوگا...... یادیں جھما جھم برسات میں بدل گئیں...... رات کے بارہ بج گئے، کرفیو نے آس پاس کے ماحول کو سناٹے میں بدل دیا تھا، ورنہ اس بڑے شہر میں گاڑیوں کی تیز روشنی اور ہارن کی آواز سے پورا شہر جاگتا رہتا ہے، لیکن آج کا پر ہول سناٹا، ایک عجیب سی ڈراؤنی کیفیت پیدا کر رہا تھا............ لیکن میں ان تمام حالات سے بے خبر یادوں کی تیز برسات میں نہار رہا تھا کہ اچانک کچھ شور سنائی دیا، میں نے جلدی سے کمپیوٹر آف کیا اور کھڑکی کے قریب گیا اور باہر نظر دوڑائی اور جو ماحول دیکھا، اس نے میرے ہوش وحواس اُڑا دیئے، باہر فلک شگاف نعرے لگ رہے تھے، لوگوں کی بھاگ دوڑ چیخ و پکار، مارو، بچاؤ، بھاگو کی خوفناک اور دلدوز آوازیں...... میں ابھی پوری بات سمجھ نہیں پایا تھا کہ اچانک میرے فلیٹ کا صدر دروازہ کو زور زور سے پیٹا جانے لگا میں نے سوچا فلیٹ والے سارے لوگ یکجا ہو گئے ہیں اور حفاظتی اقدام کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں، میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور دروازہ کھلتے ہی پندرہ بیس نوجوان دھڑ دھڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے، ان کے ہاتھوں میں برچھی، بھالا، ترشول جیسے اسلحے تھے، ان کی آنکھوں سے درندگی ٹپک رہی تھی اور کپڑوں پر خون کے چھینٹے تھے، یہ دیکھ کر میرے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی اور مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کون لوگ ہیں اور کس مقصد سے یہاں آئے ہیں، ان درندوں میں سے چند نوجوان مجھے دھکا دیتے ہوئے، دوسرے کمرے کے اندر داخل ہو گئے، شائد وہ لوگ میرے خاندان کے دیگر افراد کو تلاش کر رہے تھے، چار پانچ لڑکے میرے سامنے اسلحہ اٹھائے کھڑے رہے، اندر کمرے سے لوٹے نوجوانوں نے سامنے کھڑے نوجوانوں کو نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کچھ اشارے کئے اور پھر ایک آواز

ابھری......''منجو مار سالے کو......   ''منجو......؟ میں چونک پڑا......اس نام سے بڑی اپنا ئیت کا احساس ہوا......میں نے نظریں اٹھائیں، سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھا اور اُسے دیکھ کر میری نظریں ٹھٹھک پڑیں......ارے......یہ تو وہی لڑکا ہے جسے میں نے اوشا کے ساتھ اس دن کار میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا......تو کیا یہ منجو......؟ میری نظروں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور پھر اچانک، ان لوگوں نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پہلا وار منجو ہی نے کیا......میں کسی کٹے ہوئے تناور درخت کی طرح زمین پر گر پڑا زخم پر زخم لگنے لگے اور میرا ذہن ڈوبتا چلا گیا...... کوئی روشنی نہیں، کوئی آواز نہیں۔

اور جب کئی دنوں بعد روشنی لوٹی، کانوں میں صدائیں گونجی اور میں ہوش میں آیا، تو دیکھا، میں کسی اسپتال میں ہوں، میرا جسم زخموں سے چور ہے، نہ جانے میں کیسے بچ گیا......نظریں گھمائیں تو دیکھا میری بیوی مہہ ناز اور میرے بچے میرے گرد جمع ہیں اور ان کے چہرے غمگین ہیں، مجھے ہوش میں آتے دیکھ میری بیوی میرے قریب آ گئی اور مجھ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی اور بڑ بڑانے لگی......''خدا غارت کرے اسے جس نے اپنے جانتے ہوئے آپکو ختم ہی کر دیا تھا''۔

میں نے اس کے مُنھ پر ہاتھ رکھ دیا......نہیں مہ ناز ایسا نہ کہو......

اور میری بیوی چونک کر عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی!

☆☆☆☆☆☆☆

چاند چھپ گیا کالے بادلوں میں

وہ ہر روز کی طرح اس دن بھی صبح سویرے گھر سے نکل گیا' چھوٹی عمر اور بوجھ زیادہ لیکن شام گئے لوٹنے پر سو روپے اور کبھی سوا سو روپے کے رنگ برنگے نوٹ اور جھنجھاتے سکے لے کر واپسی کی خوشی اس کے بوجھ کو ہلکا کر دیتی۔

چاند کی عمر اس وقت تقریباً ۱۴ سال تھی۔ اس کی ماں بتاتی ہے کہ جب وہ پیدا ہوا تھا اس کا چہرہ چاند سا خوبصورت تھا لیکن زندگی کی کڑی دھوپ کی تمازت نے اس کے چاند جیسے چہرہ کو نہ صرف کملا دیا تھا، بلکہ کالا کر دیا تھا جسم پر بوسیدہ اور چیتھڑے جھول رہے کپڑے ہوتے، دبلے پتلے سے اس چاند کے ایک ہاتھ میں انگیٹھی نما کیتلی ہوتی، جس میں صبح سویرے ماں کی بنائی ہوئی گرما گرم چائے ہوتی اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کی ایک بالٹی جس میں سینکڑوں کی تعداد میں ڈسپوزبل چائے کے کپ وغیرہ ہوتے۔ وہ اس بوجھ کو لئے صبح سویرا اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر دو پر پہنچتا اور وہاں پر کھڑے خوانچوں والوں میں سے کسی کو سلام چاچا' کسی کو سلام بھیا' کہتا ہوا' دو اسٹیشن قبل سے کھلنے والی جمنا ایکسپریس کا انتظار کرنے لگتا۔ ٹرین کا انتظار کرنے والے مسافروں کے درمیان ''چائے گرم'' کی آواز لگاتا، اور اسٹیشن سے ہی چائے کی شروعات ہو جاتی اور پھر ٹرین آجاتی' ٹرین میں وہ عموماً پچھلے ڈبہ

میں سوار ہوتا اور "چائے گرم"، "چائے گرم" کی صدائیں لگاتا اس دوران چائے مانگنے
والوں کو چائے دیتا اور پیسے وصولتا ہوا آگے بڑھتا جاتا' اس طرح تقریباً دو سو کیلو میٹر کے
اس سفر میں انجن کے قریب کے ڈبہ تک پہنچتے پہنچتے اس کی چائے عموماً ختم ہو جاتی' اگر کبھی
بچ جاتی تو اسی ٹرین کی واپسی میں دو چار اسٹیشنوں کے درمیان ختم ہو جاتی اور پھر وہ آرام
سے کسی ڈبہ کے فرش پر بیٹھ کر دن بھر کی فروخت ہونے والی چائے کی رقم کو کئی کئی بار گنتا، نہ
جانے کیوں رنگ برنگے نوٹوں اور جھنجھناتے سکوں کو بار بار گننے میں اسے بڑا مزہ آتا' ان
پیسوں میں سے وہ کچھ تخمینہ لگاتا، گھر لے جانے والے سودا کا دل ہی دل میں فہرست بناتا
'باپ کی دوائیں...اور باقی بچی رقم ماں کے ہاتھ میں.. ماں کے ہاتھوں میں روپے دینے
میں اسے بڑا اچھا لگتا۔ اس تصور سے ہی وہ من ہی من میں وہ بہت خوش ہوتا۔

ماں کی خوشی میں ہی وہ اپنی خوشی تلاش کر لیتا، اسے یہ احساس تھا کہ ماں نے کبھی
خوشی دیکھی ہی نہیں، اب تک کی زندگی میں اسے دکھ مصیبتوں اور پریشانیوں کے سوا ملا ہی
کیا ہے، ایک باپ سہارا تھا' تو وہ بھی گزشتہ کئی برسوں سے ایک حادثہ کا شکار ہو کر اپاہج ہو کر
گھر کی کھاٹ پر پڑا ہے، ماں کئی گھروں میں دائی کا کام کرتی اور وہ چائے بیچتا۔ اس طرح
دو وقت کی روٹی اور جھونپڑی کے کرایہ کا انتظام ہوتا۔ زندگی کی گاڑی کسی طرح گھسٹ رہی
تھی اور اسی گھسٹتی زندگی میں اس نے اپنی پلکوں پر خواب سجائے۔ چائے بیچ بیچ کر جمع ہو
نے والی رقم سے وہ ایک دوکان کھولے گا، دوکان بڑی ہو جائیگی تو وہ ایک نوکر رکھ لے گا پھر
ماں کو کہیں دائی کا کام نہیں کرنا ہوگا، باپ کا اچھا علاج کرائیگا اور......اور......ایک دن وہ
بھی ایک گھر بسائے گا......جہاں..........جہاں......چاندنی نہائے گی.........اور ایسے
تصور کے ذہن میں آتے ہی وہ اپنے آپ شرما جاتا۔

اس دن جمنا اکسپریس کی واپسی میں' چند گھنٹوں کے اندر ہی اس کی چائے ختم ہو
گئی اور وہ اپنی عادت کے مطابق ڈبہ کے فرش پر پالتی مار کر بیٹھا اور اپنی دن بھر کی کمائی ہوئی
رقم کو گننے لگا کہ اچانک اس کے سامنے ٹرین اور مسافروں کا حفاظتی دستہ آ کر کھڑا ہو گیا۔
اس نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا' لیکن ان لوگوں نے اس کی استقبالیہ اور معصوم

مسکراہٹ کونظر انداز کرتے ہوئے چائے پلانے کو کہا' جواب میں اس نے مایوسیانہ انداز میں چائے کے ختم ہونے کا اظہار کیا اور معمول کے مطابق ایک دس روپے کا نوٹ ''روزانہ ٹیکس'' کا بڑھادیا۔

حفاظتی دستہ نے چاند کے نوٹوں سے بھرے ہاتھ کوغور سے دیکھتے ہوئے ایک بھدّی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔

''.....سالا اتنا روپیہ کمانے پر بھی روز روز یہی دس روپیہ۔؟'' جواب میں چاند نے کہا' 'صاحب ای تو میں روج دیتا ہوں........''

اور اس سے قبل کہ وہ ان لوگوں کی دز دیدہ نگاہوں سے دیکھنے والی رقم کو جھٹ سے اپنے پینٹ کی جیب میں ڈال لیتا۔حفاظتی دستہ میں سے ایک نے بڑی تیزی سے اس کے ہاتھ سے سارے روپے جھپٹ لئے۔

چاند بھونچکا رہ گیا۔ایسا تو اتنے دنوں میں کبھی نہیں ہوا تھا۔

وہ ان کے سامنے گڑگڑانے لگا۔'صاحب' ایسا مت کرو یہ میری دن بھر کی بڑی محنت کی کمائی ہے۔ اسی کمائی سے ہم تین جنوں کا پیٹ بھرتا ہے صاحب........رحم کرو.....صاحب....صاحب.....'' اور اس نے بڑی ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے روپے اس سے چھیننے کی کوشش کی'اس کی اس کوشش نے ہی حفاظتی دستہ کو آگ بگولہ کردیا۔

''سالے'' تیری اتنی ہمت کہ تو......''

اور ان میں سے دو بندوق برداروں نے بڑی بے رحمی سے اس کے بال کھینچتے ہوئے اسے پیٹنا شروع کردیا۔لیکن بے دردی سے پٹائی کو فراموش کرتا ہوا وہ بار بار اپنے روپے کی واپسی کی ضد کررہا تھا۔منت سماجت کررہا تھا'گڑگڑ رہا تھا'اپنی مجبور ماں اور اپاہج باپ کا واسطہ دے رہا تھا۔لیکن فرعونیت میں ہمدردی کا جذبہ کہاں...

اس چیخ و پکار کے ماجرا کو جب تک اس ڈبہ کے مسافر سمجھ پاتے کہ اچانک ایک بندوق بردار نے چاند کو کھینچتے ہوئے ڈبہ کے دروازے تک لایا اور حیوانیت کو شرمادینے والی اپنی ایک لات سے اُسے اتنی زور سے ٹکر ماری کہ تیز رفتار دوڑتی ٹرین کے شور میں چاند

کی دلخراش چیخ ڈوبتی چلی گئی۔

حفاظتی دستہ فاتحانہ انداز میں تیزی سے ٹرین کے دوسرے ڈبہ کی جانب بڑھ گیا۔ٹرین بھی اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔

شام کے دھند لکے میں ٹرین سے پھینکے گئے چاند کوایک گاؤں والوں نے دیکھا تو اُسے اٹھانے کی کوشش کی'لیکن وہ بے ہوش تھا'اس کا جسم زخموں سے چور تھا،جگہ جگہ سے خون بہہ رہے تھے۔

گاؤں والوں میں انسانیت جاگ اٹھی اور چاند کواٹھانے والوں میں سےایک نے فوراً ہی اپنا ٹریکٹر نکالا اور چاند کو لے پانچ سات کیلومیٹر کی دوری پر واقع ایک سرکاری اسپتال پہنچادیا۔

ڈاکٹر نے معائینہ کیا اور اس کی تشویشناک حالت کو دیکھتے ہوئے جلدی سے آپریشن کیااور تقریباً کٹ کرالگ ہوگئے اس کے بائیں پاؤں کواُس کے جسم سے جُدا کر دیا۔

ادھر رات گئے چاند گھر واپس نہیں لوٹا تو اس کی ماں کوتشویش ہوئی اورانجانے خوف سے وہ بے چین ہونے لگی۔ پڑوس کے دولڑکوں کو لےکر وہ تلاش کرتی ہوئی اسٹیشن آئی اور بہت دیر تک ادھر اُدھر کی تلاش اور پوچھ تاچھ کے بعد کسی نے بتایا کہ شام میں کسی لڑکا کے ٹرین سے گرنے کی ایک خبر ملی ہےسُنا ہے کہ وہ سرکاری اسپتال میں بھرتی ہے۔

ماں اور دونوں لڑکے بھاگے بھاگے اسپتال پہنچے۔وہاں پہنچے پر ایک جنرل وارڈ میں چاند نظر آیا'وہ چاند'جو اپنے ماں باپ کی زندگی کے اوبڑ کھابڑ راستے کا سہارا تھا خود بے سہارا ہو گیا تھا۔اس کے جسم سے ایک ٹانگ الگ ہوگئی تھی اور وہ زخموں سے چور بے ہوشی کی حالت میں کبھی اپنی ماں کویاد کر رہاتھااور کبھی وہ ظالموں سے رحم کی بھیک مانگ رہاتھا۔

ماں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو اس کی آنکھوں سے ممتا اور کرب کا دریا بہنے لگا۔''ای کا ہولئی ہمر لال،ہمر جندگی تولیلے .....اورتو ٹھیک ہوجا......''

ڈاکٹر نے ماں کے بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان ہی دوائیوں اور انجکشنوں

کی ایک فہرست تھما دی۔ ''یہ سب جلدی لا کردو.....''

آنسوؤں کو خشک کرنے کی کوشش کرتی ہوئی اس کی ماں نے ڈاکٹر کی لمبی فہرست پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا۔ ای دوائی سب میں کتنا روپے لگ جائی ؟''

''یہی تقریباً دو ہزار روپئے...'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

دو ہجار روپے......؟ ماں کے سامنے ایک بڑا سوالیہ نشان بن کر ابھرا۔؟ اتنا روپیہ ابھی ہم کہاں سے لائب ؟''

ماں نے دونوں لڑکوں کو دو چار لوگوں کے بارے میں بتایا کہ جا کر ان سے مانگو، ہمرا ہوا کے بارے میں بتیاہ........

دونوں لڑکے تیزی سے باہر نکلے....اس دوران چاند نے آنکھیں کھولیں' سامنے اپنی ماں کو' بیٹھا دیکھا اسے اطمینان ہوا' زخموں کے درد سے کراہتے ہوئے اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا........اور......اور اپنے جسم سے ایک ٹانگ غائب پا کر چیخ پڑا۔

ماں نے اسے ڈھارس بندھانے کی کوشش کی'' نا بوا نا روسب ٹھیک ہو جائی''

کچھ دیر بعد پولیس آ گئی اور اس کا فرد بیان قلم بند کرنے لگی اور جب چاند نے اس حادثہ کی تفصیل بتائی تو پولیس والے چونک پڑے۔ قلم کو بند کر دیا اور کہا ابھی یہ بہت زخمی ہے بعد میں بیان لینگے۔ یہ کہہ کر دونوں پولیس والے چل دئے' اور ان کے جاتے ہی پڑوس کے دونوں لڑکے داخل ہوئے' دونوں کے ہاتھ خالی تھے اور چہرے پر مایوسی تھی۔

ان دونوں نے ماں کو بتایا کہ سبھوں نے روپے دینے سے انکار کر دیا۔

یہ سُن کر ماں ایک انجانے خوف سے کانپ گئی۔ کا ہوئی..دوا کے بگیر ہمر بوا کیسے ٹھیک ہوئی.........؟''

رات کافی ہو چکی تھی، اس لئے صبح کا انتظار ہونے لگا۔

لیکن صبح ہوتے ہوتے بہت دیر ہو گئی۔ زخموں کا زہر پورے جسم میں سرایت کرنے لگا۔ اس کی حالت بگڑنے لگی۔

صبح ہوتے ہی ماں روپے کے انتظام میں نکل گئی۔ کئی گھنٹوں کی تگ و دو کے بعد

بڑی مشکلوں سے اسے پانچ سو روپے ملےلیکن دیر اتنی ہو چکی تھی کہ یہ پانچ سو روپے بھی بے کار ثابت ہوئے۔

بستی کے لوگوں کو چاند کے ساتھ ہوئے حادثہ کی اطلاع ملی تو آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

ای تو بہت جیادتی ہے۔رچھک ہی بھچھک بن جائےتو.......ای تو بڑا گمبھیر معاملہ ہے۔بڑا ہنگامہ ہوئی....

جواب میں ایک شخص بولا۔۔ای چاند بھی کسلئے اور گوا وہے کا' جو ہنگامہ ہوئی' اور آتال پاتال ایک ہو جائی۔ہونہہ۔

لوگوں کے درمیان چاند کا معاملہ دن بھر چرچا کا موضوع رہااور ادھر شام ہوتے ہوتے چاند کی زندگی کی لو مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی۔ چاند کو موت کے کالے کالے بادلوں نے ڈھک لیا۔

ضروری اندراج اور پوسٹ مارٹم کے بعد چاند کی لاش کو اسکی ماں کے حوالے کر دیا گیا۔

ماں اپنے چند پڑوسیوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے غموں کا دریا بہاتے ہوئے ایک آٹو رکشہ پر اپنے چاند کی لاش کے ساتھ اپنی بستی کی جانب چل دی۔

راستے میں بھیڑ کی وجہ کر آٹو رکشہ ایک جگہ رُک گیا۔ایک انتخابی جلسہ میں انصاف اور غریبوں کے مسیحا ہونے کا دعویٰ کرنے والے ایک نیتا کی دھواں دھار تقریر چل رہی تھی۔''ہم نے ہمیشہ غریبوں کو انصاف دلانے کی کوشش کی ہے غریبوں پر ہونے والے ظلم اور سوشن کے خلاف آواز اُٹھاتا رہا ہوں' میرے رہتے ہوئے کوئی کسی غریب پہ انئیائے نہیں کر سکتا....

نیتا کی یہ آواز چاند کی ماں کے کانوں تک پہنچی اور اس کا جی چاہا،وہ وہاں پر اتر جائے اور سامنے پڑے پتھروں کے ڈھیر سے پتھر اٹھا کر اس نیتا پر برسانے لگے۔

☆☆☆☆

یہ عشق نہیں آساں..........!

مارننگ واک روز کا معمول تھا ریٹائرمنٹ کے بعد سونی سونی زندگی میں مارننگ واک کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، صبح سویرے گھر سے نکل کر نیشنل پارک تک پہنچتے پہنچتے ہم ریٹائرڈ دوستوں کی تعداد پانچ سات تک ہو جاتی اور یہاں پہنچ کر دو مخصوص بنچوں پر ہم لوگ آمنے سامنے بیٹھ جاتے، خوش گپیاں ہوتیں، اور ان خوش گپیوں کے دوران کبھی سیاسی کبھی سماجی اور کبھی معاشرتی حالات پر طرح طرح کے تبصرے ہوتے اور ہر کوئی اپنے تجربے اور مشاہدے کا بھرپور اظہار کرتا ـــــ اس طرح اچھا خاصہ وقت گزر جاتا اور پھر وہی گھر جہاں کا سونا سونا ماحول، خاموش در و دیوار، گم صم بیوی کا چہرہ اور انتظار.....صرف انتظار۔ کسی کے فون کا.....کسی کے کال بیل کا.....کسی کے آنے کا.....''

آج جب میں مارننگ واک کے لئے نکلا تو راستے ہی میں فرہاد صاحب مل گئے، ذرا آگے بڑھا تو دیکھا پروفیسر غلام قادر اور جناب شاہد اختر سبک روی سے آگے بڑھ رہے ہیں، ہم دونوں بھی لپک کر ان کے ساتھ ہو لئے، سلام کلام کے بعد خوش گپیوں کے ساتھ ہم لوگ نیشنل پارک پہنچے، وہاں قبل سے ہی بھائی رضوان کوثر، ڈاکٹر حسین الحق اور جناب عبدالقادر موجود تھے۔

جناب عبدالقادر کے ہاتھ میں آج کا تازہ اخبار تھا اور موضوع بحث عشق ومحبت تھا۔

میں چونک پڑا اس عمر میں یہ عشق ومحبت کی باتیں......؟

مجھے دیکھتے ہی عبدالقادر صاحب کہنے لگے۔

''آیئے آیئے آپ ہی کا انتظار تھا''

میں نے چونکتے ہوئے پوچھا ''یہ عشق ومحبت میں مجھے کہاں گھسیٹ رہے ہیں میرا ان باتوں سے کیا تعلق''۔

''تعلق''؟ عبدالقادر نے میرے ادا کئے لفظ کو سوالیہ انداز میں دہرایا اور ایک زبردست قہقہہ لگایا اور ان کے اس قہقہ میں میرے سوا سبھوں نے ساتھ دیا۔

ویسے تو صبح کے وقت ہم لوگ اسی طرح عام طور پر ہر چھوٹی بڑی بات پر ٹھہا کے لگانے کے عادی تھے۔لافر تھیر ہی کا بھرپور مظاہرہ ہوتا۔لیکن اس وقت ان لوگوں کا قہقہہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ویسے میں سمجھ گیا،ان کے اس قہقہہ کے پس پشت کیا تھا۔دراصل میں نے ایک دن نہ جانے کن جذباتی لمحوں سے معمور ہوکر اپنے عشق کی وہ داستان سُنا دی تھی، جس کی حسین وادیوں کو میں اب تک بھول نہیں پایا اس وادی کا ایک ایک رومان پرور منظر میری آنکھوں میں سمایا ہوا ہے۔لیکن اُس دن تو ان لوگوں نے میرے عشق کی داستان کو بڑی سنجیدگی اور گہری دلچسپی سے سنی تھی۔لیکن آج یہ میرے عشق کو اس انداز سے کیوں لے رہے ہیں۔

میرے چہرے پر ناراضگی کے نقوش پڑھ کر عبدالقادر صاحب بول پڑے۔

''ارے بھائی آپ خفا نہ ہوں دراصل آج کے اخبار کے پہلے ہی صفحہ پر ویلینٹائن ڈے کہاں اور کس طرح منایا گیا،اس کی تفصیل شائع ہوئی ہے کروڑوں روپے کے تحفے تحائف، پھولوں کے گلدستے فروخت ہوئے مختلف شہروں کے ریستراں میں لاکھوں روپے کی شراب کا رومانی جوڑوں نے لطف اٹھایا اور تو اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں بڑے پیانے پر لوسلیبریشن (Love Celebration) منایا گیا۔اور.....

ارے چھوڑیئے جناب، آج کی کنزیومر سوسائٹی۔(Consumer Society) میں پیار محبت کے پاک رشتوں کو بھی Cash کرایا جارہا ہے۔ یہ مہنگے تحفے تحائف، شراب کے نشے میں دھینگامشتی۔ کیا یہی اظہار عشق ہے، ارے یہ عشق نہیں، آوارگی ہے'' پرفیسر رضوان کوثر نے عبدالقادر کی بات کاٹتے ہوئے اپنی دانشورانہ رائے دی۔

''آپ صحیح فرما رہے ہیں رضوان کوثر صاحب، عشق کیا ہے یہ عشق کرنے والا ہی بتا سکتا ہے۔ دل میں اُٹھتے ہوئے سوز کا نام ہے عشق۔ ڈاکٹر حسین الحق نے بھی اپنے رومانی ہونے کا ثبوت دیا اور سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگے۔

میں یادوں کے گہرے سمندر میں ڈوب ابھر رہا تھا، سبھوں نے میری جانب اس انداز سے دیکھا کہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ عشق کے متعلق میری کیا رائے ہے۔

میں نے انہیں مایوس نہیں کیا، اور بتایا کہ عشق ایک احساس ایک جزبے کا نام ہے اس کی کوئی شکل وصورت نہیں اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، معشوق کے چہرے کی تازگی اور شادابی کو دیکھنا ہے، تو کھلے ہوئے خوبصورت پھولوں کو دیکھو اس کی آواز کو سننا ہو تو گرتے جھرنے کی مترنم کو سنو اس کی انگڑائیوں میں جو مدہوشی ہوتی ہے، اس کی اداؤں میں جو دلفریبی ہوتی ہے، اس کی مخمور نگاہوں میں جو سحر ہوتا ہے، اس کی آمد کے انتظار میں جو اضطراب ہوتا ہے اور اس کے آتے ہی باغوں میں بادصبا کا احساس ہوتا ہے پوری فضا ایک خاص خوشبو سے مہک اٹھتی ہے، اس کے صندلی جسم کی خوشبو ہواؤں میں بکھر جاتی ہے، دودھیا چاندنی میں نہایا اس کا پیکر۔ جس لمحہ شرماتے ہوئے گھبرائے ہوئے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے، ان لمحوں کو اپنی آنکھوں میں، اپنے دل و دماغ میں قید کرنے کو جی چاہتا ہے اور......

''ارے جناب آپ تو نثر میں شاعری کرنے لگے عشق کی کیفیات اور معشوقہ کی پرکیف تفصیلات نے تو ہم لوگوں کو جوانی کی یاد دلادی'' شاہد اختر صاحب نے میرے اظہار بیان سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

یہ جوانی اور بڑھاپا کہاں سے آگیا، عشق کی محسوسات کے لئے اور عشق کے لئے عمر کی بھی قید نہیں، ہاں سماج نے اسے ضرور عمر کی قیدو بند میں جکڑ دیا ہے، عشق کی انجانی

لذتوں کو کبھی بھی کسی بھی لمحہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میں آپ لوگوں سے مخاطب ہوں اور وہ خیالوں کی دہلیز سے اتر کر میرے دل و دماغ میں اپنی دلفریب اداؤں کے ساتھ سما گئی ہے میرے شانوں پر رکھے اس کے پیار بھرے ہاتھ کا لمس، روح پر دست صبا ہو جیسے اور یہ باتیں صرف محسوس کرنے کی ہے اور احساس کے لئے حساس ہونا ضروری ہے جوانی یا بڑھاپے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ صرف ایک شعر آپ لوگ مظہر امام کا سن لیں بس میری بات آپ لوگوں کو سمجھ میں آجائیگی' مظہر امام نے کہا ہے۔

میرے سب خواب تاروں کی طرح ٹوٹے، مگر اس کا
گلوں کی اوس میں بھیگا ہوا پیکر نہیں بدلا

شعر سن کر سبھی خاموش ہو گئے' نہ جانے وہ شعر کی معنویت میں ڈوب گئے یا اپنے اپنے عشق کی قندیلیں روشن کرنے لگے۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر اچانک خاموشی کو توڑتے ہوئے شاہد اختر گویا ہوئے۔

''ٹھیک ہے جناب،، مگر یہ ویلینٹائن ڈے کیا ہے کیوں ہے؟

ویلینٹائن ڈے جو لوگ منا رہے ہیں وہ اس کی حقیقت سے واقف ہیں اور نہ ہی اس کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ رومن راجہ کلاڈیس کا یہ حکم تھا کہ چونکہ شادی کرنے سے مردوں کی طاقت جسم' عقل اور قوت فیصلہ میں کمی آجاتی ہے، اس لئے شادی کسی کو نہیں کرنا ہے۔ لیکن سینٹ ویلنٹائن نے اس حکم کے خلاف ہزاروں فوجیوں کی شادی کرادی' اس حکم عدولی کی پاداش میں ۱۴ار فروری کو راجہ نے اسے پھانسی کی سزا دے دی۔ اس لئے اس کو یادگار کے طور پر منایا جانے لگا۔ بعد میں اُسے (Love Celebration) لوسیلیبریشن کا نام دے دیا گیا اور مغربی تہذیب کی بھونڈی نقالی ہمارے نوجوان کر رہے ہیں۔ پیار و محبت ایک احساس ہے، دو جسم کا ملن پیار نہیں Love Celebration کے لئے ہمارے یہاں تو مثالیں بھری پڑی ہیں، مجنوں فرہاد' قیس اور سب سے بڑھکر پوری دنیا کے

لئے ہمارے یہاں محبت کی عظیم نشانی تاج محل ہے۔"

میری ان باتوں کو سننے کے بعد ایک بار پھر خاموشی طاری ہوگئی' بات کو آگے بڑھانے کا سرا ڈھونڈنے لگے لوگ۔ لیکن اچانک غلام قادر کھڑے ہوگئے۔ اب چلا جائے، کافی دیر ہوگئی ہے۔

ان کے اٹھتے ہی سبھی لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے' ہم لوگ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے، سبھوں کے دل و دماغ میں طرح طرح کے خیالات ڈوب ابھر رہے تھے، پھر ہم لوگ اس موڑ پر آگئے' جہاں سے ہم لوگوں کے راستے بدل جاتے ہیں' اچانک غلام قادر کی نظر آویزاں ایک بڑے سائن بورڈ پر پڑتی ہے۔ وہ اسے پڑھنے لگے' انھیں رک کر سائن بورڈ پڑھتے دیکھ کر ہم لوگوں کی نگاہیں بھی اسی طرف اٹھ گئیں۔ بورڈ پر لکھا تھا۔

موریہ کلنک۔۔اَن چاہے گربھ (حمل) سے چھٹکارا
راز کو راز رکھنے کا وعدہ۔ آج ہی ملیں

اس عبارت کو سبھوں نے پڑھا اور پڑھنے کے بعد عبدالقادر نے برجستہ کہا۔
"یہی ہے عشق کا ماحصل" اور یہ کہتے ہوئے سبھوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

ان لوگوں کا یہ قہقہہ سن کر مجھے ایسا لگا جیسے ان لوگوں نے میرے عشق کو سر بازار ننگا کر دیا۔ میں گھبرا گیا تیز دھوپ میرے بدن میں نوکیلے کانٹے کی طرح چبھنے لگی اور ایسا لگا جیسے میں کسی صحرا کے بیچ و بیچ کھڑا ہوں اور چاروں سمت سے ہواؤں کے مرغولے اٹھ رہے ہوں۔

میں تیز قدموں سے واپسی کے لئے مڑ گیا!!

☆☆☆

شکاری فاختاؤں کے

حکم ملتے ہی میں ایک خاص علاقہ کی بغات کی سرکوبی کے لئے سپاہیوں کی ایک ٹکڑی لے کر نکل پڑا۔ علاقہ کے اندر داخل ہوا تو دیکھا ہر سمت سے کالے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے، اور انسانی چیخ و پکار سے پورا علاقہ کراہ رہا تھا' باغیوں نے ایک سرکاری دفتر پر حملہ کر اُسے نذر آتش کر دیا تھا، جس کے جواب میں فوجیوں نے گولیوں کی بوچھار کر دی تھی، جس سے کافی لوگ زخمی ہوئے تھے اور کچھ لوگوں کی موت بھی واقع ہو گئی تھی۔

سپاہیوں کے ساتھ الرٹ پوزیشن میں علاقہ میں میرے داخل ہوتے ہی ہر طرف سناٹا چھا گیا، گولیوں کی بوچھار کا خوف اور موت کے تصور نے باغیوں کو اپنے اپنے گھروں میں دبک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہاں جس گھر کا کوئی فرد زخمی ہوا تھا یا مارا گیا تھا، ان گھروں سے آہ و بکا کی آوازیں سناٹے کو چیر رہی تھی۔ ادھر دھیان دئے بغیر میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ہم پر پتھروں سے حملہ کر دیا گیا، میرے فوجیوں نے ان پر بندوقیں تان لیں اور میری جانب فائرنگ کے آرڈر کے لئے منتظر نظر آئے لیکن میں نے فائرنگ کا آرڈر نہیں دیا، اس لئے کہ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ ہم پر پتھروں سے حملہ کرنے والے نہتے بچے

اور چند جوان لڑکیاں تھیں جوفوج کی گولیوں سے اپنے کسی فرد کے شدید زخمی ہونے یا مرنے پر اپنی برہمی کا برملا اظہار کررہی تھیں ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا،لیکن ان کے اندر جو جرأت ہمت اور غم وغصہ تھاوہ حیرت ناک تھا۔

میں چاہتا تو میرے ایک اشارے پر وہ دس بارہ برس کے بچے اور جوان لڑکیاں ،میرے سپاہیوں کی گولیوں کا نشانہ بن سکتے تھے۔لیکن میں نے انہیں صرف کھدیرنے کا حکم دیا اور خود ہی ان کے پیچھے دوڑ پڑا۔ ہم لوگوں کو دوڑتا دیکھ کر وہ بچے اور لڑکیاں بھاگتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے۔

اس درمیان میرے جوانوں نے پتھروں سے حملہ کرنے والی چند نو جوان لڑکیوں کوگرفتار کرلیا' جس کی وہ سخت مزاحمت کررہی تھیں اور خاص بات یہ تھی کہ یہ لڑکیاں سپاہیوں سے رحم کی بھیک مانگنے کی بجائے انھیں گالیوں سے نواز رہی تھیں۔

اس پورے علاقے کوخوف و دہشت کے ماحول میں ڈوبا دیکھ کر ہم لوگ شام گئے اپنی چھاؤنی میں واپس آگئے اور پھر دن بھر کی تھکان اور باغیوں کے حوصلے پست کر دینے کا جشن شراب سے بھرے جام سے جام ٹکرا کرمنانے لگےاوررات گئے جب شراب کا نشہ بدمست کرنے لگا' تواس شراب کی بدمستی میں شباب کوبھی گھول دیا گیا۔

گرفتار کی گئی لڑکیوں میں سب سے خوبصورت اور نو خیزلڑکی ڈولی کو میں نے اپنے لئے منتخب کیا۔

لڑکی کو جب میرے کمرے میں لایا گیا،تو میں نے بغور اس پر ایک نظر ڈالی' وہ بلا کی حسین اور نوخیز تھی گلابی رنگت لئے ،اس کا شاداب چہرہ،ستواں ناک ،نرگسی اور مخمور آنکھیں، رسیلے، پتلے سرخ ہونٹ، جیسے ان میں شہد بھرا ہو، کالی گھنیری زلفیں' لمبی خوبصورت صراحی دارگردن اوراس کےاس متناسب جسم پر دو ابھار' دعوت شباب دے رہے تھے،وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی ،جیسے کوئی فاختہ کسی شکاری کے ہاتھ میں قید ہو کر اپنی معصوم لیکن بے بس نگاہوں سے دیکھ رہی ہو' اوراپنی آزادی کے لئے کسمسا رہی ہو۔

شراب سے بدمست میری نگاہوں نے بغور اس کے حسن و جمال کا معائینہ کیااور

اس کی تمام تر رحم کی اپیل اور مذاحمت کو مسترد کرتے ہوئے اس کے خوبصورت جسم پر کے بوسیدہ اور افلاس زدہ کپڑے میں نے اتار پھینکے۔اس کے نوخیز اور حسین بدن پر سے کپڑوں کے ہٹتے ہی اس کا دودھیا چاندنی میں نہایا جسم میری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگا اور میں بے تاب ہوکر اس کے جسم سے کھیلنے لگا،اس کے بدن کے پور پور سے ایسی خوشبو اور لذت مجھے مل رہی تھی کہ سینکڑوں بوتل پرانی شراب کا نشہ بھی اس کے سامنے بے معنیٰ اور بے کیف تھا اور میں اس نشے مین ڈوبتا چلا گیا'اور پھر چند گھنٹوں بعد ہی مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میں نے سینکڑوں میل کی مسافت دوڑتے ہوئے طئے کی ہے اور منزل پر پہنچ کر میں ہانپتا ہوا گر پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ فاختا نما حسینہ درد و کرب کی مجسم تصویر بنی، دوسرے کمرے میں لے جائی گئی، جہاں سے چیخ' کراہ اور قہقہے کی آوازیں گونجتی رہیں، لیکن میں ان سب سے بے نیاز بہت جلد نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

دوسری صبح میں تیار ہوکر ناشتہ کی میز پر تھا کہ ایک سپاہی نے سیلوٹ کیا اور کہا۔

''ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے''

میں نے حیرت سے پوچھا۔''کون ہے''

جواب میں سپاہی نے بتایا کہ''وہ کوئی انجان آدمی ہے اور آپ سے ملنے کو بضد ہے۔''

میں نے ناشتہ ختم کر کافی کی چسکیوں کے درمیان اس آدمی کو اندر بلانے کو کہا۔ جب وہ آدمی اندر میرے سامنے آکر کھڑا ہوا تو، میں نے دیکھا پچاس ،پچپن سال کے درمیان کا ایک غریب آدمی ہے جو میرے لئے بالکل انجان ہے اور لباس اور انداز سے مقامی لگ رہا تھا۔

اسے بغور دیکھتے ہوئے میں نے اس سے سوال کیا۔

''کہو، کیا بات ہے، تم کیوں مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔''؟

جواب میں وہ میرے قدموں پر گر پڑا اور زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگا۔

''حضور، میں اس علاقہ کا ایک بے حد غریب مزدور ہوں، میں دوسرے علاقے میں مزدوری کرنے گیا تھا،شام گئے واپس لوٹا،تو معلوم ہوا،علاقے میں ہنگامہ ہو گیا تھا اور اس

ہنگامہ میں میرا بیٹا مارا گیا اور میری بیٹی ڈولی غائب ہے۔ ہر جگہ اسے ڈھونڈا لیکن اس کا کہیں کچھ پتہ نہیں چلا، بعد میں معلوم ہوا کہ اسے گرفتار کر یہاں لایا گیا ہے اور.....اور حضور ہملوگوں کا قصور کیا ہے؟ جو اتنی بڑی سزا دی جا رہی ہے، میری بیٹی کو آزاد کر دیجئے کم از کم وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا آخری دیدار تو کر سکے، میں زندگی بھر اس کے لئے آپکا احسان مند رہونگا.........''

فرط جذبات میں وہ بولتا چلا گیا، اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر تک 'میں کچھ سوچتا رہا اور پھر اس سے مخاطب ہو کر کہا۔'' تم جاؤ تمہاری بیٹی آزاد کر دی جائیگی۔''

وہ مجھے دعائیں دیتا ہوا باہر نکل گیا' اور میں نے اپنے ایک سپاہی کو بلا کر حکم دیا کہ رات والی اس لڑکی ڈولی کو آزاد کر دو، اور آزاد کرنے سے پہلے اسے سمجھا دو کہ اس کے ساتھ جو کچھ بھی یہاں ہوا ہے اسے بھول جائے، کسی کو کچھ بتائیگی نہیں' ورنہ اسے پھر گرفتار کر لیا جائیگا اور اس کی ذمہ دار وہ خود ہوگی۔

میں یہ حکم دے کر سپاہیوں کی ایک ٹکڑی لے کر دوسرے علاقوں کے دورہ پر نکل گیا اور جہاں کہیں بھی کوئی باغیانہ مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ان کی سرکوبی کے لئے کہیں گولیاں چلواتا، کہیں لاٹھی چارج کراتا، کہیں کہیں کھدیرنے سے بھی کام چل جاتا، شام ئئے تک حالات کو قابو کرنے کے دوران کئی لاشیں گرتیں، کچھ لوگ زخمی ہوتے ا رکچھ گرفتاریاں بھی ہوتیں اور گرفتار ہونے والوں میں درجنوں مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ چند لڑکیاں ضرور ہوتیں۔

یہی چند لڑکیاں رات گئے چھاؤنی میں میرے اور دوسرے سپاہیوں کی تھکان مٹانے کا ذریعہ بنتیں۔

ان علاقوں میں باغیانہ مظاہرے ہوتے کئی ماہ ہو چکے تھے، اس درمیاں جہاں سینکڑوں مقامی افراد مارے گئے تھے، وہیں ہمارے درجنوں سپاہی بھی شہید ہوئے تھے، لیکن باغیانہ جدوجہد میں کوئی کمی نہیں آرہی تھی، اور اب تو مقامی مظاہرین کے غم وغصہ کا

نشانہ ہم لوگ بھی بن رہے تھے،اس لئے ہم لوگوں نے اپنے گرد حفاظتی انتظامات سخت کر دیے تھے،لیکن خوف کے سائے میں بھی ڈیوٹی کے بعد شراب اور شباب کے سرور و مستی میں ڈوب جانے کا سلسلہ جاری رہااور اس شراب و شباب کا طویل سلسلہ میری صحت پر مضر اثرات ڈالنے لگا' کبھی کبھی میں خود کو بے حد مضمحل اور اندر سے بہت کمزور محسوس کرنے لگا۔

ایک دن جب ڈیوٹی پر نکل رہا تھا کہ اچانک میں لڑکھڑا کر گر پڑااور بے ہوش ہو گیا۔ سپاہیوں نے ملٹری اسپتال میں داخل کر دایا جہاں معائنہ کے بعد ڈاکٹروں نے فوری طور پر میری شراب نوشی پر پابندی لگادی اور بتایا کہ میرے جسم کے دونوں گردے خراب ہو چکے ہیں اور اگر جلد ہی انہیں تبدیل نہیں کیا گیا تو جان جانے کا خطرہ لاحق ہے۔

ڈاکٹروں کی ان باتوں سے میں پریشان ہو گیااور میری نظروں کے سامنے موت کا سایہ منڈرانے لگا،میرے دل و دماغ پر اس کے منفی اثرات مرتب ہونے لگےاور بہت تیزی سے میری صحت گرنے لگی۔

اسپتال کے ڈاکٹروں کو بھی میری گرتی صحت دیکھ کر تشویش ہونے لگی اور وہ لوگ گردے کا عطیہ دینے والے کی تلاش میں رہنے لگے۔اس کے لئے ان لوگوں نے اخبارات میں اشتہار بھی شائع کرائے۔

ایک دن اچانک ایک ڈاکٹر خوشی سے اچھلتا ہوا میرے پاس آیااور بتایا کہ''ایک مقامی شخص جو اپنی زندگی سے بیزار ہے'جوان بیٹے کی موت اور جوان بیٹی کی خودکشی کے بعد' اسے زندگی بے معنی لگ رہی ہے'وہ اپنا گردہ عطیہ کرنے کو تیار ہے——''اس کی باتیں سنتے ہی'میری باچھیں کھل گئیں'ڈاکٹر کی باتوں نے میری بجھتی زندگی میں روشنی کا جھماکہ کر دیا اور میں بے اختیار بستر سے اُٹھ کر ڈاکٹر سے لپٹ گیا ڈاکٹر اب تم مجھے بچا سکتے ہو، اب مجھے نئی زندگی دے سکتے ہو۔

ڈاکٹر نے مجھے تسلی دی اور کہا۔''ہاں' آج ہی میں اس شخص سے ملونگا اور دو تین دنوں کے اندر آپریشن کر کر گردہ تبدیل کر دیا جائیگا۔

چند دنوں بعد ہی میں انتہائی نگہداشت یونٹ میں رکھا گیااور ایک ہفتہ کے اندر

ہی آپریشن کے بعد روم میں واپس لایا گیا' میرا آپریشن کامیاب ہوا تھا۔

ڈاکٹر بہت خوش تھے اور ان سے کہیں زیادہ نئی زندگی ملنے پر میں خوش تھا اور اس خوشی سے سرشار ہوکر میں نے ڈاکٹر سے خواہش کا اظہار کیا کہ میں اپنے اس محسن سے ملنا چاہتا ہوں جس نے میری ڈوبتی زندگی کے ناؤ کو منجدھار سے نکالنے کے لئے اپنی زندگی کی کشتی کو بھنور میں ڈال دیا۔

ڈاکٹر نے میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے دوسرے عام کمرہ میں گردہ نکلنے کے بعد علاج کرار ہے ایک شخص کو بلالایا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا' مجھے اس کا چہرہ آشنا لگا، میں اپنی یادداشت پر زور دینے لگا، کہاں دیکھا ہے، اس شخص کو؟ کہاں ملا ہوں میں اس سے؟

اچانک ایک جھماکہ ہوا۔ بجلی سی کوندی اور میرا پورا وجود سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا' وہ شخص اور کوئی نہیں' فاختہ جیسی معصوم حسینہ ڈولی کا وہ باپ تھا۔ جس کے ساتھ میں نے اور......اور...!

میرا دل ڈوبنے لگا، آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا اور میں اندھیرے گھپ اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا!!!

☆☆☆☆
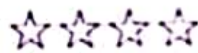
پہرے خوابوں پر

ارے مدنا' ادھر ٹیبل صاف کر' کیا کر رہا ہے رے' ادھر پانی دے، ارے دیکھ سالے برتن اٹھا...... یہ سالا مدنا تو ایکدم کوڑھیا ہے، سالے سے کوئی کام ہی نہیں ہوتا..... اُدھر کا تاک رہا ہے......اور او حرامی رجوا کدھر گیا؟ سالا' اپنی بہن کا بھتار کھوج رہا ہے کا......

مدن اور راجو دس بارہ برس کے یہ لڑکے کرین میموریل اسکول کے پاس کے ایک ہوٹل میں صبح سے رات گئے تک ایسے ہی الفاظ سنتے رہتے۔ کبھی ہوٹل کا مالک ڈانٹتا ' کبھی کوئی گاہک آ کر گالیوں سے نوازتا اور کبھی......

یہ دونوں بھی ان گالیوں کے عادی ہو گئے تھے۔ روز روز کی گالیوں سے بھی بے مزہ نہیں ہوتے' ہاں گالیاں اور ڈانٹ سننے کے بعد ان کے ہاتھ گندے ٹیبل صاف کرنے اور جوٹھے برتن اٹھانے میں تیزی سے چلنے لگتے۔

مدن اور راجو دونوں دو گاؤں سے لائے گئے تھے، ماں کی موت کے بعد، ان کے باپ نے دوسری شادی کر لی' تب دور کے رشتہ داروں نے انھیں اس ہوٹل میں لا کر رکھ دیا تھا کہ ہوٹل میں کام کر کے بھوک سے تو نجات مل جائیگی، ورنہ حالات ایسے تھے کہ کئی کئی روز

انہیں لوگوں کی دی ہوئی ایک آدھ روٹیوں پر ہی گزارا کرنا پڑتا تھا۔

ان دونوں کے گندمی رنگ کو زندگی کی تیز دھوپ نے سیاہ مائل کر دیا تھا، نیکر اور گنجی نے بھی اپنی رنگت کھو دیا تھا اور لگاتار ہفتوں پہنے رہنے پر ان کپڑوں کا رنگ ہی کالا ہو گیا تھا۔ ہاں دو ٹائم سیر ہو کر یہ دونوں ہوٹل والے کا دیا ہوا کھانا کھاتے' پھر دن بھر گالیاں کھاتے اور رات گئے ہوٹل کا سارا برتن دھو کر سوتے' تو انہیں کچھ ہوش نہیں رہتا' کبھی کسی روز رات گئے انہیں محسوس ہوتا کہ کوئی ان کا نیکرا تار رہا ہے اور گندی گندی حرکتیں کر رہا ہے۔ وہ احتجاج کرتے' لیکن پچیس تیس سال کے بڑے نوکر، انہیں دھمکی دیتے'' چپ چاپ رہ نہیں تو مالک سے کہہ کر نکلوا دونگا پھر سالے بھوکوں مرو گے'' اور انہیں اپنی بھوک کی شدت یاد آتی اور وہ دونوں کراہ کراحتجاج کرتے رہ جاتے اور اب تو وہ بڑے نوکروں کی ان حرکتوں کے بھی عادی ہو گئے تھے۔

رات سے صبح کیسے ہو جاتی انہیں کچھ پتا ہی نہیں چلتا' رات کے اندھیرے میں سوتے اور اجالے کی کرن پھیلنے سے قبل ہی ہوٹل کے مالک کی ٹھوکروں سے وہ جاگ جاتے اور پھر کولھو کے بیل کی طرح جت جاتے....کام......گالیاں....گندی حرکت..... یہ سب تو روز کا معمول بن گیا تھا.....

جس روڈ پر ہوٹل واقع تھا۔ اس روڈ پر کئی سکول تھے طرح طرح کے چھوٹے بڑے اسکول......صبح سویرے اس روڈ پر بچے ہی بچے نظر آتے' پیدل سائیکل پر اسکوٹر، موٹر سائیکل پر۔ بسوں میں، ٹمپو میں بیٹھے ہوئے' طرح طرح کے ڈریسوں اور ٹائیوں میں موٹے موٹے بستوں کے ساتھ کوئی بچہ ماں کی انگلی پکڑے ہوئے کوئی بچہ اپنے باپ کے ساتھ اسکول جاتا ہوا.....

صبح کا یہ نظارہ دیکھ کر مدن اور راجو کو کچھ عجیب سا لگتا...کاش انہیں بھی کوئی ان کی انگلیاں پکڑ کر اسکول لے جاتا ان کے کپڑے بھی ایسے ہی صاف وشفاف ہوتے' ڈریس پر خوبصورت ٹائی ہوتی، بھاری بھرکم کتابوں کا پیوں اور لنچ بوکس سے بھرا بستہ ہوتا۔ اور وہ....بھی......

تصوراتی دنیا میں وہ لمحے بھر کے لئے اترتے ہی کہ اچانک.....ہوٹل کے مالک کی کڑک دار آواز گونجتی۔''ارے سالا کھڑا کاہے ہے رے ٹیبل کا تورا باپ صاف کرے گا'' اور یہ سنتے ہی ان کے ہاتھ بڑی تیزی سے ٹیبل صاف کرنے لگتے' دوڑ کر دوسرے ٹیبل پر کے جوٹھے برتن اٹھانے لگتے' کہ تاخیر ہونے پر کہیں ہوٹل کے مالک کی ایک آدھ لات ان پر نہ پڑ جائے۔اس لئے کہ وہ دونوں اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ان کی حیثیت یہاں سڑکوں پر گھومنے والے آوارہ کتوں سے بھی بدتر ہے کہ جو جب چاہتا ہے، پتھر اٹھا کر مار دیتا ہے۔

ایک دن روزانہ آنے والا ایک گاہک جو چائے پینے کے ساتھ ساتھ صبح کا اخبار بھی پڑھتا تھا اور وہ ان دونوں سے مانوس بھی تھا۔اخبار پڑھتے پڑھتے اچانک وہ ان دونوں سے مخاطب ہوا....''ارے مدن اور راجو سُن تمرے لاکھوں کھری ہے،اب تو لوئن کو کام کرے پر پابندی لگ گیا ہے، چھوٹا لڑکن لوگ ہوٹل کارکھانہ گیراج میں کام نہ کرے گا اور سب لڑکن لوگ اسکول جائیگا.....''

اخبار کی یہ بات اس گاہک کی زبانی سنکر انہیں بڑا اچھا لگا۔

''تو کا ہم ہو اب اسکول جائب؟''راجو نے اس گاہک سے سوال کیا' راجو کے ساتھ ساتھ مدن بھی تجسس بھری نگاہوں سے گاہک کو دیکھنے لگا۔

''ہاں رے اب تو ای کانون بن گیا ہے''

گاہک نے بڑے اطمینان سے اسے جواب دیا

.....اور اس جواب نے مدن اور راجو کو ایک بار پھر خوابوں کی وادیوں میں پہنچا دیا۔ پڑھائی..... پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا.......اس کا بھی ایک پریوار ہوگا...اچھے کپڑے..... اچھی زندگی......

اچانک ایک بھدی سی گالی نے انہیں چونکا دیا۔

''ارے سالا' جا کر کوئلہ توڑ کر لا اور چولہا میں ڈال ، دیکھ آگ دھیما ہو رہا ہے......''

اور راجو دوڑتا ہوا گیا اور کوئلہ توڑنے لگا اور مدن ٹوٹے ہوئے کوئلوں کو چولہا میں ڈالنے لگا۔

دونوں خاموشی سے کام میں منہمک تھے، لیکن ان کے دل و دماغ میں گاہک کی بات بازگشت کر رہی تھی..."اب چھوٹا لڑکن لوگ کو کام کرنے پر پابندی لگ گیا ہے...... انہیں پڑھائی لکھائی میں لگایا جائیگا.....اور.....اور.........."

دونوں کو گاہک کی بات بڑی اچھی لگی تھی۔

اچانک ان کے خیالات، حقیقت کے چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو گئے۔

لیکن ہم رہینگے کہاں؟ اور کھائنگے کیا۔ کون ہمیں اپنے پاس رکھ کر کھلائیگا اور اسکول بھیجے گا—اور ایک بار پھر انہیں وہ وقت یاد آیا جب وہ بھوک سے تڑپتے تھے اور کوئی انہیں سہارا دینے کو تیار نہیں تھا۔

چھوڑ یار یہی جندگی اچھی ہے، دن بھر کام کے بعد پیٹ بھر کھانا تو ملتا ہے۔

اور......پھر دونوں سر جھٹک کر ٹیبل صاف کرنے اور جوٹھے برتن اُٹھانے میں مشغول ہو گئے۔
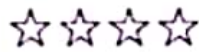
جلتی بجھتی قندیلیں احساس کی

شادی کو دو سال کیسے گزر گئے، پتا ہی نہیں چلا، شادی کی دوسری سالگرہ کے روز، صبح صبح جب دوستوں اور رشتہ داروں کے ہیپی میرج ڈے کے فون اور لگاتار ایس.ایم.ایس کا سلسلہ شروع ہوا، تو شاہد اور نسرین کو خیال ہوا کہ شادی کو دو سال ہو گئے، اور یہ دو سال ایسے گزر گئے، جیسے دو دن — اور ان دو دنوں میں دونوں کو اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس نے زیادہ ایک دوسرے کو پیار اور رفاقت دی۔ اس لئے کہ نسرین، شاہد کے لئے مجسم محبت کی پیکر تھی، تو شاہد، نسرین کے لئے پیار کا وہ آبشار تھا، جو ہر پل، ہر لمحہ اپنے دل کی گہرائیوں سے نسرین کے دل، دماغ، آنکھوں، ہونٹوں، زلفوں پر پیار کی بوچھار کرتا رہتا — صبح سے شام اور شام سے رات — اور رات سے صبح تک، بس پیار ہی پیار کا خزانہ دونوں ایک دوسرے پر لٹاتے رہتے۔

صبح سویرے دونوں کی تقریباً ایک ساتھ نیند کھلتی، شب کے گزارے لمحات کی یادیں دونوں کو گدگداتیں، دونوں ایک دوسرے سے شرماتے اور شرماتے شرماتے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے، ایک دوسرے کو پیار کرتے اور تھوڑی دیر بعد نسرین، شاہد کی بانہوں سے نکلنے کی کوشش کرتی۔

''اب اٹھئے' بستر چھوڑیئے' دیر ہورہی ہے' آج پھر دفتر پہنچنے میں دیر ہوجائیگی''۔

''ارے چھوڑو دفتر' دیر ہوجائے تو کیا' تمہاری آغوش میں بتائے یہ پل' یہ لمحے بہت قیمتی ہیں' میرے لئے۔ تمہاری یہ گھنیری کالی زلفیں' تمہارا یہ سنا شاداب چہرہ' یہ ستواں ناک' یہ نرگسی آنکھیں' یہ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے شہد بھرے ہونٹ' تمہاری یہ مخروطی انگلیاں اور تمہارا یہ گداز بدن......''

''دھت' آپ تو شاعری کرنے لگے''

''ارے جان من' جب میرے پاس سراپا غزل موجود ہو' تو پھر شاعری کی کیا ضرورت''؟

''اچھی بات ہے' جناب' لیکن اب چھوڑیئے بھی' آج صبح کی چائے کا ارادہ نہیں ہے کیا''؟

چائے کا خیال آتے ہی' شاہد' نسرین کو اپنی گرفت سے آزاد کردیتا اور نسرین شرارت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی جلدی سے شاہد کے گال پر ایک پیار بھرا بوسہ لیتی ہوئی' بھاگ کھڑی ہوتی اور شاہد' اس بوسے کے لطیف احساس میں کھوجاتا۔

نسرین تھوڑی دیر بعد چائے لے کر آتی' دونوں ساتھ ساتھ چائے پیتے' اس درمیان' نسرین' سامنے پڑے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ میں اپنے چہرے پر جگہ جگہ پڑے طرح طرح کے داغوں کو دیکھ کر اپنی انگلیوں سے رگڑ رگڑ کر مٹانے کی کوشش کرتی۔

نسرین کی ان حرکتوں کو شاہد' غور سے دیکھتا اور لطف اندوز ہوتا اور پھر جان کر انجان بنتے ہوئے پوچھتا— ''یہ کیا کر رہی ہو''؟

نسرین شرماجاتی اور شرمانے کی جو اس کی ادا ہوتی' وہ سیدھے شاہد کے دل میں اتر جاتی اور شاہد' بے اختیار ہو کر نسرین کو بھینچ لیتا اور اس کے گالوں پر محبت بھرا ایک اور داغ دے دیتا۔

نسرین' بناوٹی خفگی کا اظہار کرتی ہوئی' اس کی آغوش سے نکل جاتی' اور شاہد کو

کھینچتے ہوئے' اسے باتھ روم میں دھکیل دیتی۔

باتھ روم سے شاہد نہا دھو کر باہر نکلتا تو دیکھتا' ڈائننگ ٹیبل پر گرما گرم ناشتہ لئے نسرین انتظار کر رہی ہے — دونوں مل کر ناشتہ کرتے' چائے پیتے اور پھر شاہد جتنی دیر میں دفتر جانے کے لئے تیار ہوتا اتنی دیر میں نسرین شاہد کے لئے ٹفن تیار کر لیتی اور ٹفن باکس اسکے بیگ میں رکھ کر' اسے دفتر کے لئے روانہ کر دیتی اور شاہد جاتے جاتے پیار بھرے کئی بوسے اسکے گالوں اور ہونٹوں پر ثبت کر دیتا۔

شاہد دفتر کے لئے اسکوٹر سے روانہ ہو جاتا اور نسرین' ڈرائنگ روم' بیڈ روم اور کچن وغیرہ کو درست کرنے میں لگ جاتی اور پھر خود نہا دھو کر ٹی.وی. کے مختلف چینلوں کو دیکھتے ہوئے وقت گذارنے کی کوشش کرتی' کبھی کسی سے فون پر باتیں کرتی' اور کبھی اپنے فلیٹ سے نکل کر کچھ ضروری سامان لانے چل دیتی۔ اس دوران شاہد کے کئی بار فون آتے اور فون پر بھی وہی پیار محبت اور ساتھ میں کھانہ کھایا یا نہیں' آج کا کیا پروگرام ہے' کہاں چلنا ہے' ڈنر نہیں بنانا ہے' کسی ہوٹل میں کھائیں گے۔

شاہد گھر لوٹتا اور نسرین دلا آویز مسکراہٹ سے اسکا استقبال کرتی' تو شاہد دفتر کی ساری الجھنوں' پریشانیوں کو بھول جاتا اور بے اختیار نسرین کو اپنی بانہوں میں بھر لیتا پھر دونوں ساتھ ساتھ چائے پیتے اور پھر جلدی سے تیار ہو کر اسکوٹر پر سوار ہو کر مارکیٹنگ اور کسی اچھے ریستراں کے لئے نکل جاتے ....

اس طرح ان دونوں کی صبح خوشگوار' شام سہانی اور رات پر بہار گذرتی ——— بس وہ چند گھنٹے' جب شاہد دفتر میں ہوتا اور نسرین گھر کے سارے کام نپٹا کر ٹی.وی. دیکھ دیکھ کر بور ہونے لگتی' تب شاہد کے انتظار میں وہ چند گھنٹے کاٹے نہیں کٹتے۔ دوپہر کو کھانے کے بعد وہ ایک نیند بھی لے لیتی اور جاگنے کے بعد چائے بناتی لیکن اسے شاہد کے بغیر چائے اچھی نہیں لگتی' کبھی کبھی تو وہ چائے بناتی' لیکن پھر وہ اسے تپائی پر چھوڑ دیتی — شاہد آئینگے تب ساتھ ساتھ چائے پی جائینگی — انتظار کبھی کبھی کوفت میں بدل جاتی اور ایک دن نسرین

نے شاہد سے اس کا اظہار کیا۔۔۔

''آپ کے دفتر جانے کے بعد میں بہت بور ہوتی ہوں اس لئے میں اب آپ کے ساتھ ہی دفتر جاؤ نگی''۔

''تم دفتر جا کر کیا کرو گی''؟

''بس' سامنے بیٹھ کر آپ کو دیکھتی رہونگی میرا وقت کٹ جائیگا' آپ یقین کیجئے میں آپ کو قطعی ڈسٹرب نہیں کروں گی''۔

شاہد نسرین کی اس معصومیت پر ٹھہا کے لگا کر ہنسنے لگا۔ اور ہنستے ہنستے پھر وہ سنجیدہ ہو جاتا ہے اور نسرین کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

''ہاں' مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ تم میری غیر موجودگی میں بور ہوتی ہو گی' تم ایسا کرو' اخبار کا جاب کالم دیکھنا شروع کر دو' کوئی اچھی ویکنسی نظر آئے تو تم اس میں اپلائی کر دو۔ تمہارے جاب جوائن کرنے سے دو فائدہ ہوگا' پہلا تو یہ کہ تمہاری بوریت دور ہو جائیگی اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ہم دونوں نے ملکر جو خواب دیکھے ہیں اپنا ایک بنگلہ بنے نیارا۔۔۔ اور گھومنے کے لئے ایک نئی چمچماتی کار''۔۔۔

نسرین کو بھی شاہد کا یہ مشورہ پسند آیا اور اس نے دوسرے دن سے ہی اخبار کا جاب کالم بغور پڑھنا شروع کر دیا اور دو چار جگہ اپلائی بھی کر دیا۔۔۔ کئی جگہ سے انٹرویو کے لئے کال آئے اور آخر کار ایک جگہ اسے پی. آر. او کی نوکری مل گئی۔۔۔ اپوائنٹمینٹ لیٹر جس دن ملا' اس دن دونوں بہت خوش ہوئے اور خوشی میں شاہد نے شاندار ڈنر ایک شاندار ریستراں میں کھلایا۔۔۔

دوسرے ہی دن نسرین نے جاب جوائن کر لیا' دو چار دن وہ شاہد کے ساتھ دفتر گئی' واپسی میں کبھی شاہد کو دیر ہو جاتی تو وہ لوکل ٹرین یا بس سے واپس آ جاتی۔۔۔ آہستہ آہستہ اسکی جھجھک ختم ہو گئی۔۔۔ اور وہ تنہا ہی دفتر آنے جانے لگی۔

دفتر میں سارے لوگ' اس کی عزت کرتے' ایک تو عہدے کا رعب اور دوسرے

اسکے حسن و جمال کی سحر انگیزی' جو بھی دیکھتا' مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا' اس کا ایک سینئر پی. آر. او. ارشد تو اس کا خاص خیال رکھتا' کام سیکھنے میں اس نے اس کی کافی مدد کی' جب کوئی مسئلہ نسرین کے سامنے آن کھڑا ہوتا' وہ ارشد سے مدد لیتی اور ارشد بڑی خندہ پیشانی سے اسکے مسئلہ کو چٹکی میں حل کر دیتا— ارشد جاب میں اس کا سینئر ضرور تھا' لیکن اسکی عمر زیادہ نہیں تھی۔ یہی تقریباً ۳۵ برس کے آس پاس ہوگی۔ ہینڈسم اور اسمارٹ تھا، جاب جوائن کئے ہوئے بھی اسے صرف دو سال ہوئے تھے' آدمی ذہین تھا اس لئے وہ اپنے فیلڈ میں ماہر تھا' لیکن کبھی بھی نسرین کو اس نے اپنا ماتحت نہیں سمجھا' بلکہ ہمیشہ ایک اچھے کولیگ کی طرح' اس کا سلوک ہوتا— شادی اسنے ابھی تک نہیں کی تھی اس سلسلے میں اسکا کہنا تھا ابھی اتنی جلدی کیا ہے پہلے اپنی کوئی حیثیت بنا لے' پھر شادی اور.....................

نسرین' ارشد کی یہ باتیں سنتی اور مسکرا کر رہ جاتی' اور نسرین کی یہ مسکراہٹ ارشد کو بڑی اچھی لگتی اور وہ اکثر ایسی باتیں کرتا' جس سے نسرین مسکرانے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑتی—

ان دونوں کے بظاہر دو کیبن تھے' بس درمیان میں شیشے کی دیوار حائل تھی' اس لئے نسرین' ارشد کی اور ارشد' نسرین کی ہر حرکت و عمل کو دیکھتے رہتے' لنچ کے وقت اکثر ارشد نسرین کے کیبن میں آ جاتا اور دونوں ساتھ ساتھ ہی لنچ کرتے— ایک دن نسرین نے پوچھا تھا—

''آپ کو یہ لنچ باکس کون دیتا ہے''؟

ارشد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا— ''میں خود ہی بناتا ہوں اب جیسا بھی بن جائے لنچ اور ڈنر بناتے بناتے میں اب اچھا کوک بھی بن گیا ہو' کبھی موقعہ ملا تو آپ کو اپنے ہاتھوں کا چکن مغلئی ضرور کھلاؤں گا۔ میں واقعی بہت اچھا بناتا ہوں۔

ارشد کی اس بات کو سن کر وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی اور ارشد یہی چاہتا بھی تھا اس لئے کہ نسرین جب ہنستی تھی تو اسکے گلابی گالوں کے داہنی طرف ڈمپل ابھر آتا تھا۔ جو اسے بڑا

اچھا لگتا تھا اور ہنستے ہنستے نسرین کا چہرہ گلابی سے سرخ ہو جاتا' اور اس وقت وہ بلا کی حسین لگتی۔

نسرین' شاہد ہی کی طرح دفتری الجھنوں کو دفتر میں ہی چھوڑ آتی ' گھر پہنچ کر دونوں میں سے کوئی بھی دفتر کے کام کو ڈسکس نہیں کرتے' کبھی شاہد نے نسرین سے دفتر کا حال پوچھا بھی تو' نسرین نے ہنستے ہوئے جواب دیا — ''نو' نو آفس پلیز''۔

اور شاہد نسرین کا جواب سن کر ہنستے ہوئے کہتا۔'' او کے ڈارلنگ'' — اور آگے بڑھ کر اسکی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے چمٹا لیتا۔

نسرین بھی یہی چاہتی تھی کہ آفس کی مصروفیات کے بعد گھر میں وہ اور صرف شاہد کی چاہتیں رہیں' محبت اور پیار رہے اور اسی طرح دونوں ایک دوسرے پر اپنی جان نچھاور کرتے رہیں۔

لیکن! ادھر چند دنوں سے وہ اپنے اندر کچھ تبدیلی محسوس کر رہی تھی' ذہن کو جھٹکنے کی کئی بار اس نے کوشش کی' لیکن ارشد کسی خوشبو کی طرح اس کے ذہن میں بستا چلا جا رہا تھا — دفتر جانے کے لئے وہ تیار ہونے لگتی' اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ کے سامنے کھڑی ہوتی تو چپکے سے ارشد' اس کے ذہن سے اتر کر سامنے آئینہ میں کھڑا ہو جاتا۔ یہ ہیئر اسٹائل' ایسے نہیں ایسے کرو' لپ اسٹک یہ نہیں وہ لگاؤ۔ یہ کان میں پڑے بندے کئی دن ہو گئے' آج سوٹ سے میچ کرتا ہوا ٹاپس کانوں میں ڈالو' اور یہ ناک کا بیسر' سفید نگ والا اچھا لگے گا اور یہ.................. یہ.................. !

نسرین عجیب کشمکش میں پڑ جاتی' کبھی مسکراتے ہوئے' وہ ان باتوں کو مان لیتی اور کبھی جھلا جاتی اور اونچی آواز میں شاہد کو آواز دیتی۔

''شاہد — ادھر آؤ' تم بتاؤ' آج میں کانوں میں کون سا ٹاپس پہنوں' ناک کا بیسر کون سا اچھا لگے گا اور یہ لپ اسٹک ٹھیک ہے نا''؟

شاہد چونکتا' اور نسرین کے قریب پہنچ کر اپنی ٹائی کے ناٹ کو درست کرتا ہوا کہتا —

''ارے میری جان' تم جو بھی پہن لو' خوبصورت ہی لگو گی' یہ سب نہیں پہنو گی تو

بھی تمہارے حسن میں کمی نہیں آئیگی''۔

اور نسرین اس کے اس پیار کے اظہار پر بناوٹی خفگی کا اظہار کرتی ـــ ''دھت' تم تو ہمیشہ.................ارے کبھی تو سیریس ہوا کرو''۔

''سیریس اور میں؟ یہ ناممکن ہے میری جان! اگر تم مجھے قتل بھی کرنا چاہو' تب بھی میں تمہارے ہاتھوں ہنستے ہنستے جان دے دونگا لیکن سیریس نہیں ہوؤں گا۔ ہاں صرف تمہاری جُدائی میں برداشت نہیں کرسکتا''۔

''اے' بکواس نہیں' مجھے ایسے مذاق پسند نہیں' شاہد کی باتوں کو سن کر نسرین واقعی سیریس ہوجاتی اور اپنے غصہ کا اظہار کرتی ـــ

شاہد نسرین کو اپنے سینے سے لگالیتا' اور کہتا۔

''ارے نہیں' میں تو یونہی مذاق کررہا تھا۔ تم خفا کیوں ہورہی ہو' اچھا چلو جلدی کرو دفتر میں ہم دونوں کو کہیں دیر نہ ہوجائے''۔

یہ کہتا ہوا شاہد نسرین کے ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور فلیٹ سے باہر آجاتا' فلیٹ کے باہری دروازے پر قفل لگاتا ہوا لفٹ سے نیچے اُترتا اور پھر اسکوٹر پر نسرین کو بٹھا کر بس اسٹاپ پر چھوڑتا ہوا آگے بڑھ جاتا' دونوں کے دفتر دو سمت میں تھے' اس لئے نسرین کبھی لوکل ٹرین یا بس سے دفتر جاتی۔

نسرین دفتر پہنچتی اور پھر دن بھر دفتر کی مصروفیات' نہ چاہتے ہوئے بھی ارشد سے کئی بار آفیشیل میٹر پر ڈسکشن اور لنچ ٹائم میں اپنا لنچ باکس لئے ہوئے ارشد کے اس کے کیبن میں آجانے پر ساتھ ساتھ لنچ اور پھر کینٹین کی چائے اور چائے کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں۔

ارشد کا اس کے ساتھ رویہ اس قدر مہذب اور اتنی ہمدردی و خلوص سے بھرا ہوتا کہ وہ جب کبھی اس کے کیبن میں آتا یا اسے چائے یا کافی کے لئے بلواتا' وہ انکار نہیں کر پاتی ـــ

لیکن ادھر وہ اپنے اندر جو تبدیلی محسوس کررہی تھی' اس سے وہ بہت پریشان تھی ـــ

اس کی پوری کوشش ہوتی کہ آفس کے بعد آفس کے ہر کام' ہر ملاقات' ہر عمل کو آفس میں ہی چھوڑ دے لیکن چاہ کر بھی ایسا نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایک دن نہ جانے کس بے خیالی میں اسنے اپنے ٹفن باکس میں' ایک خاص ڈش اور چند زائد روٹیاں رکھ لی تھیں اور لنچ کے وقت اس نے ارشد کو کہا تھا — ''لیجئے' آج میں نے آپ کے لئے لنچ لایا ہے' آپ روز روز سینڈوچ کھاتے ہیں'' —

ارشد بہت خوش ہوا' اور اس نے اس کے مکس ویجیٹبل ڈش کی بہت تعریف کی اور انگلیاں چاٹ چاٹ کر اس ڈش کو روٹی کے ساتھ کھایا اور کہا تھا — ''آج اپنی مرحومہ کی یاد آگئی وہ بھی اسی طرح مکس ویجیٹبل بناتی تھی''۔

نسرین پر نفسیاتی اثر پڑا' وہ اپنے ڈش کی تعریف سن کر بہت خوش ہوئی —

اس رات وہ بہت بے چین نظر آئی' دیر رات تک اسے نیند نہیں آئی' شاہد کب کا معمول کے مطابق اسے گڈ نائٹ کہہ کر سو گیا تھا اور وہ کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی — ارشد نے اپنے خلوص ہمدردی اور اپنی مردانہ وجاہت کا ایسا سحر کر دیا تھا کہ وہ ذہن سے اسے بار بار جھٹکتی' لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی — اور دھیرے دھیرے اسنے محسوس کیا' ارشد اسکے ذہن سے ہوتا ہوا اس کے دل میں اترتا چلا جا رہا ہے' وہ کبھی ۔ بے خیالی میں مسکرا دیتی اور کبھی پریشان ہو جاتی — اور بے چینی کے عالم میں' وہ کروٹ بدل کر بے خبر سوئے ہوئے شاہد کے سینے سے سٹ جاتی' اسے چمٹا لیتی — اس کی اس دیوانگی سے اچانک شاہد کی نیند ٹوٹ جاتی' وہ نائٹ بلب کی روشنی میں نسرین کو غور سے دیکھتا ہے' اور پوچھتا ہے —

''کیوں کیا بات ہے' نیند نہیں آرہی ہے؟ کوئی پرابلم''؟

نسرین' شاہد کی بات سن کر خاموش رہی اسے محسوس ہوا' جیسے شاہد نے اس کے دل میں جھانک کر کچھ دیکھ لیا ہو۔

نسرین خاموش ہی رہتی ہے' شاہد سے چمٹ کر سونے کی کوشش کرتی ہے' کافی

کوششوں کے بعد اسے نیند آتی ہے' لیکن نیند آنے کے بعد تو وہ اور بے بس نظر آئی' خواب میں ارشد' کبھی اس کی زلفوں سے کھیلتا کبھی اس کے انگارے جیسے دہکتے رخساروں کو چھوتا ہے'، کبھی اس کے نرم ملائم اور خوبصورت ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے — اور نسرین جیسے کسی مجسمہ میں تبدیل ہوگئی ہو' ارشد کی ان حرکتوں کو وہ صرف دیکھ رہی تھی' محسوس کر رہی تھی' لیکن اس کی زبان جیسے گنگ ہوگئی تھی۔ پورا جسم جیسے بے جان اور ساکت ہو گیا ہو..................

صبح اس کی دیر سے نیند ٹوٹی اور رات کی اس کی بے چینی اور خواب کی وادیوں کی یادوں نے اسے مذید پریشان کر دیا۔

شاہد نے اسے کچھ پریشان دیکھا تو پوچھا'' کیوں کیا بات ہے' رات میں بھی تم کافی بے چین لگ رہی تھی۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا''؟

''ہاں' ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں' رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی اسلئے ذرا کسلمندی ہے'' —

''نیند کیوں نہیں آئی''؟

شاہد کا یہ سوال تیر بن کر اسکے سینے میں اتر گیا — وہ جواب دے تو کیا — کیا وہ یہ بتا دے' اس کا کولیگ ارشد دھیرے دھیرے اس کے ذہن سے ہوتا ہوا اسکے دل میں اترنے لگا ہے اور اب تو وہ خواب میں بھی آنے لگا ہے۔

نسرین کے دل و دماغ میں عجیب سی کشمکش اور جنگ چل رہی تھی' اس کشمکش اور جنگ کے درمیان وہ دفتر جانے کی تیاری میں مشغول رہی' معمول کے مطابق شاہد کو ناشتہ کرایا' ٹفن دیا اور پھر دونوں دفتر کے لئے ساتھ نکلے۔

نسرین دفتر پہنچ کر اپنے کیبن میں خود کو بے حد مصروف رکھنے کی کوشش کرتی ہے ایک بار چپراسی اسے بلانے کے لئے بھی آیا کہ ارشد صاحب چائے کے لئے بلا رہے ہیں' لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہہ دو میں کام میں بہت بزی ہوں' درمیان میں لگے شیشے کی

طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھنے کے لئے اسے سخت جدوجہد کرنا پڑی اور اس نے کوشش کی کہ وہ شیشے کی طرف نگاہ تک نہیں اُٹھائے گی۔

لیکن اس کی یہ تمام کوششیں اس وقت بے معنیٰ ہوگئیں، جب لنچ ٹائم ہوتے ہی ارشد اپنا لنچ باکس لئے ہوئے اس کے کیبن میں آ گیا اور بولا—''آج کیا بات ہے' کام بہت زیادہ ہے' یا موڈ خراب ہے''؟

نسرین نے نظر اٹھا کر ارشد کو دیکھا اور کھڑی ہوتی ہوئی پوری ہمت جٹا کر چیخ پڑی۔

''مجھے کام زیادہ ہے یا میرا موڈ خراب ہے' اس سے آپ کو کیا مطلب' اور یہ آپ روز روز لنچ باکس لئے ہوئے یہاں میرے کیبن میں کیوں چلے آتے ہیں؟ یہ کیبن کیا کوئی کینٹین ہے' جایئے' اپنے کیبن میں اور پھر کبھی میری اجازت کے بغیر میرے کیبن میں آنے کی ہمت نہیں کرنا— یہ کہتی ہوئی وہ ہانپتی ہوئی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی' نڈھال اور بے جان سی۔

ارشد' نسرین کے اس تیور کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' یہ اچانک کیا ہوا' وہ بڑی خاموش اور اداس قدموں سے واپسی کے لئے مڑ گیا بڑے بھاری قدموں سے وہ اپنے کیبن میں پہنچا' اور نظریں اُٹھا کر شیشے کے پار اسے نسرین کو دیکھا— وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔

ارشد' نسرین کی اس حرکت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے اپنا لنچ باکس ٹیبل پر پٹک دیا' جس سے ٹیبل پر رکھا شیشہ چٹک گیا اور قریب میں رکھا تازہ پھولوں کا گلدستہ فرش پر گر کر بکھر گیا۔

شام گئے نسرین نے نوکری سے اپنا استعفیٰ نامہ چپراسی کے ہاتھوں میں تھماتی ہوئی گھر واپس آ گئی اور بستر پر ڈھیر ہوگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆☆☆

بازگشت: "ریزہ ریزہ خواب" کی

- غیاث احمد گدی
- رام لعل
- کلام حیدری
- جوگندر پال
- احمد یوسف
- معین شاہد
- بدر اورنگ آبادی
- محمود ایوبی
- م۔ق۔خاں
- شفق
- شوکت حیات
- حسین الحق
- رضوان احمد
- حمید سہروردی
- مشتاق احمد نوری
- نور الحسنین
- اختر واصف
- تسکین زیدی
- خورشید حیات
- اصغر علی انجینیر
- عبدالمغنی
- تاراچرن رستوگی
- وہاب اشرفی
- وارث علوی
- علیم اللہ حالی
- عنوان چشتی
- قمر اعظم ہاشمی
- سرسوتی سرن کیف
- مناظر عاشق ہرگانوی
- تاج انور
- عثمان عارف
- شہنشاہ مرزا
- احمد حسین شمس
- انجم آراء انجم
- جاوید حیات
- طارق فاطمی
- قیصر جمال

☆غیاث احمد گدی (جھریا دھنباد)

جدید تر اُردو فکشن کی دنیا میں سیّد احمد قادری کی آمد علامتی اور تجریدی نظا
اظہار کے نام پر ژولیدہ بیان اور فنکارانہ خامکاری کی بوجھل فضا میں ہوا کے خوشگوار جھونکے
سے کم نہیں۔ اظہار بیان کی صفائی، ماجرا سازی اور کردار نگاری کا دروبست، تہہ در تہہ زندگی
کا عرفان اور اس سے گہری وابستگی سیّد احمد قادری کی تخلیقی جہت کی نمایاں پہچان ہے۔

("ریزہ ریزہ خواب" کے فیلپ سے)

☆رام لعل (لکھنئو)

نئے لکھنے والوں میں ایک نام سید احمد قادری کا بھی ہے جو افسانہ اور تنقید پر
خاصی قدرت رکھتا ہے جن کے افکار سے نہ صرف افسانے کی روایت قائم رہتی ہے بلکہ
اس میں عصری تقاضوں کا اہتمام بھی ہے۔

("ریزہ ریزہ خواب" کے فلیپ سے)

☆کلام حیدری (گیا)

قادری کے تقریباً سبھی افسانوں میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ وہ مسئلوں کو
افسانے نہیں بناتے، ان کے افسانوں سے مسئلوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ حل کے چکر
میں بھی نہیں پڑتے، کیونکہ سیوا ان کا Object ہو سکتا ہے Target نہیں ہے۔

("ریزہ ریزہ خواب" کے فلیپ سے)

☆جوگندر پال (نئی دھلی)

"ریزہ ریزہ خواب" کی کہانیاں میں نے بڑی دلچسپی اور انہماک سے پڑھی
ہیں۔ کسی بھی فنکار کے یہاں اس کے امکانات کی دھوپ چھاؤں میں دراصل اس کی
سچائیوں کی صلاحیت کا ہاتھ رہتا ہے۔

☆احمد یوسف (پٹنہ)

سیّد احمد قادری کا تعلق افسانہ نگاروں کے اس قافلے سے ہے جو افسانے میں کہانی کے عنصر کو بے حد اہم قرار دیتا ہے کہ افسانے نے اسی زمین سے جنم لیا ہے۔

☆معین شاھد (گیا)

سیّد احمد قادری کو اپنی باتوں کو کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ اپنے احساسات اور جذبات کو افسانوں میں اس طرح فنّی طور پر پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

(آفتاب عالم، لکھنؤ، ۲۰؍فروری ۱۹۸۷ء)

☆بدر اورنگ آبادی (گیا)

جہیز کی لعنت کی بدولت لڑکیوں کی شادی میں دشواریوں کی کئی مثالیں قادری کے علم میں تھیں۔ اس کا حساس دل تڑپ اُٹھتا تھا اور اس کی یہ تڑپ اور چبھن ''سرخ جوڑے'' کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اگر یہ کہانی قادری کے بجائے کوئی دوسرا افسانہ نگار بھی لکھتا تو میں یہی کہتا کہ یہ اُردو فکشن میں کئی جہت سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور اس کہانی کی اہمیت کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ ان کا ترجمہ انگریزی کے مئوقر روزنامہ ''Patriot'' میں چھپا۔ 'اُداسیاں' کے پنشن یافتہ بوڑھے انکل کی آنکھوں میں تنہائی کے باعث جب آنسو تیرنے لگے تو بچوں کو بڑی حیرت ہوئی اور وہ پوچھتے ہیں...... ''انکل، تم کیوں رو رہے ہو؟'' اور جواب؟ ''تم ان آنسوؤں کو نہیں سمجھو گے میرے بچو'' اس وقت تک جب تک کہ یہ آنسو تمہاری آنکھوں سے گریں''۔ کون سا دل ہے جو اس سیدھے سادے جملے سے تڑپ نہ اُٹھے۔ یہ معمولی سا جملہ ہر دل میں چبھن پیدا کر دینے پر قادر ہے۔

یہ ہے قادری کے فن کا کمال اور اس کی شناخت۔ ''آنگن کی بات'' بقول ڈاکٹر حسین الحق'' سید احمد قادری کی بتدریج ارتقائی رویے کا ثبوت ہے۔ یہ کہانی دراصل عہد

حاضر کے اس اجتماعی رویے کی نشاندہی کرتا ہے جو بزرگوں اور ماضی سے اجتماعی بے نیازی اور اپرواہی کا اشاریہ ہے"   (''ترسیل'' جنوری ۱۹۸۹ء)

☆محمود ایوبی (ممبئی)

''کنارہ دور'' شاید جنتا حکومت کے کھیون ہارون کا ماجرا ہے؟ یہ علامتی اور اشاراتی چیزیں اپنے پلّے کم ہی پڑتی ہیں۔ اس لئے لکھ رہا ہوں۔ اس کے دعویداروں کی تعداد کم نہیں، مگر یہ اقرار کی جرأت نہیں رکھتے، بلکہ الٹی سیدھی تاویلیں پیش کر کے ڈھٹائی دیکھاتے ہیں۔

☆م. ق. خاں (گیا)

Quadri's pen has all along been fighting a crusade against social injustice, exploitation of the weaker classes of the society. Weather it may be labour or a women. He picks up his own sarrounding. He never lets his fancy room at large in the world of dream or abstract or airy.

(Indian Nation)

☆شفق (سہسرام)

سیّد احمد قادری بیانیہ کے اس پُل صراط سے کامیابی سے گذر جاتے ہیں جس پر اکثر جدید افسانہ نگار قدم رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں اور رکھنے کی کوشش انہیں دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ عہد حاضر کے اُلجھے ہوئے سلگتے مسائل اور بیانیہ اسلوب کی وجہ سے قاری پوری توجہ سے ان کی باتیں سنتا ہے۔ چاہے وہ آنگن کی بات ہو یا ''سسکتے لمحوں'' کا کرب، ''لمحوں کا درد'' ہو یا ''قیدی'' بند آنکھوں کا سپنا''، فاصلہ قریب کا ہو یا کنارہ دور کا،

یہ باتیں جو جگ بیتی ہیں آپ بیتی معلوم ہوتی ہیں۔

(''ریزہ ریزہ خواب'' کے فلیپ سے)

☆شوکت حیات (پٹنہ)

نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں سیّد احمد قادری نمایاں نظر آتے ہیں ان کے یہاں سماجی اور سیاسی شعور کو افسانوی قالب میں ڈھالنے کی ہنرمندی، انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ کہانیوں میں واقعات کو پوری تہہ داری کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ ان کی کہانیوں کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

(''ریزہ ریزہ خواب'' کے فلیپ سے)

☆حسین الحق (گیا)

............موضوعات کے لحاظ سے بھی سید احمد قادری شعوری طور پر سماج کے اہم مسائل کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ وہ ہندوستانی معاشرے میں عورت کی بے بسی کو اپنا موضوع بناتے ہیں، جن کی مثالیں ضرب احساس، بوجھ، کالا گلاب اور سرخ جوڑے وغیرہ افسانوں میں ملتی ہیں..................!

افسانہ ''فاصلہ قریب کا'' جسے سیّد احمد قادری نے ۴۷ء اور ۷۱ء کے نام معنون کیا ہے۔ اس میں Partition کا درد و کرب پوری طرح ابھر کر سامنے آیا ہے جو بے حد متاثر کرتا ہے۔

ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ سید احمد قادری تیسری آواز کی نمائندگی بڑی کامیابی سے کر رہے ہیں۔

(''ترسیل''، جنوری ۱۹۸۹ء)

☆رضوان احمد (پٹنہ)

سیّد احمد قادری کے افسانے تکنیک، بیان، فکر اور اسلوب کا منفرد منظر نامہ پیش

کرتے ہیں ان کے افسانے ایک جانب جہاں عرفانِ ذات کا وسیلہ بنتے ہیں، وہیں کائنات کی وسعتوں میں پھیلتے چلے جاتے ہیں۔

(''ریزہ ریزہ خواب'' کے فلیپ سے)

☆حمید سہروردی (گلبرگہ' کرناٹک)

''ریزہ ریزہ خواب'' میں شامل افسانوں میں مسائل فکر انگیز ہونے کے بجائے فکرمندی کے ساتھ تجربات اور محسوسات کو شدت سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ ایک مرکز پر آ کر رُکتا ہے اور افسانہ نگار کے چونکانے کا عمل تیز ہے۔
سید احمد قادری معاشرتی و معاشی مسائل سے باخبر ہیں اور ان مسائل میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کا افسانہ اپنے پیش رو افسانہ نگاروں کی طرح المیہ اور نشاطیہ نہیں ہوتا۔ انہوں نے فرد کی بے بسی اور مجبوری کو فطری انداز میں درج کر دی ہے۔ ان کے افسانے زندگی سے باتیں کرتے ہیں، خواب کی نہیں۔

(گلبن' احمد آباد' جنوری/۱۹۸۷ء)

☆مشتاق احمد نوری (پٹنہ)

سید احمد قادری صرف بیرونی مناظر نہیں پیش کرتے بلکہ محسوسات کے نہاں خانوں، کشمکش، پیچیدگی اور درد و کرب کی لہروں کو بھی سمیٹ کر اپنی انتہائی مشاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

(ماہنامہ ''ترسیل'' فروری/۱۹۸۶ء)

☆نور الحسنین (اورنگ آباد' مہاراشٹر)

سید احمد قادری کی بہترین کہانیوں میں شہرِ خموشاں، منظر یوں تھا، قیدی، یادوں کا المیہ، اجنبی راہیں، خواب، کنارہ دور اور گمشدہ اجالے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔

اکثر مقامات پر ان کا قلم کسی ماہر فوٹوگرافر کی طرح ایک ایک منظر کو فریم کر دیتا ہے۔ سید احمد قادری اپنے فن پر کڑی نظریں رکھتے ہیں۔

(''ترسیل'' جنوری ۱۹۸۹ء)

☆اختر واصف (پٹنہ)

سیّد احمد قادری کے اندر کہانی بننے' پھیلانے اور پھر اسے Close کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے یہاں تخلیقی اُپج کی بھی کمی نہیں۔ کہانی کے ذریعہ قاری کو اپنے گرفت میں لینے اور اپنی بات صحیح طریقے سے Convay کرنے کے گر سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں..........!

اس مجموعے میں کئی کہانیاں ایسی ہیں، جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ ''فاصلہ قریب کا'' میرے خیال سے اس مجموعے کی بہترین کہانی ہے.......... دوسری اچھی کہانیوں میں ''کنارہ دور''، ''آنگن کی بات'' اور ''یادوں کا المیہ'' وغیرہ کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

(''نقاد'' ۳۰؍دسمبر ۱۹۸۷ء)

☆تسکین زیدی (کانپور)

سیّد احمد قادری نئی نسل کے ان کہانی کاروں میں ہیں جنہوں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کے یہاں عصری مسائل کا پورا احساس ملتا ہے۔

☆خورشید حیات (بلاس پور)

سیّد احمد قادری کی کہانی جو سیدھے سادے انداز میں مدّھم سُروں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ ارتقا کی منزل تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے کہ ایک ایک لفظ قارئین کے لئے جہان معنی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔

(ہماری زبان، نئی دہلی ۱۵؍جون ۸۶ء)

☆اصغر علی انجینئر (ممبئی)

سیّد احمد قادری زندگی کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں اور زندگی اور اس کے پیچیدہ تقاضوں سے اپنی کہانیوں میں بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ کہانی ان کے یہاں کہانی ہی رہتی ہے۔ کیونکہ کہانی کہنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ یہ زندگی کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں اور یہی ان کی نظریاتی وابستگی ہے۔ سارتر کے مطابق لکھنے کا فعل ہی وابستگی کا اعلان ہے اور قادری کی ہر کہانی یہ اعلان مبہم نہیں، بڑے واضح طور پر دھیرے نہیں بانگ دہل کرتی ہے۔

''ریزہ ریزہ خواب'' قادری کی بیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض کہانیاں کمزور ہیں، بعض اچھی اور بعض بہت اچھی بھی۔ مجموعے کا نام بھی احمد قادری کی زندگی کے رویئے کا اعلان کرتا ہے۔ زندگی ایک سُندر سپنا بھی ہے اور انسان کو ریزہ ریزہ کردینے والی حقیقت بھی۔ ایک تخلیقی فنکار سُندر سپنا دیکھ کر ریزہ ریزہ کردینے والی حقیقت کو بھی گوارا بنالیتا ہے۔ اس کی بہترین مثال قادری کی کہانی ''سُرخ جوڑے'' ہے۔ یہ کہانی قادری کی بہترین کہانیوں میں شمار کی جائے گی۔

(''بلٹز'' (ممبئی) ۲۲/اگست ۱۹۷۸ء)

☆ڈاکٹر عبد المغنی (پٹنہ)

سیّد احمد قادری کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں زبردست عصری حسّیت اور انسانیت کا ایک شدید احساس ہے۔ چنانچہ فنکار نے اپنے موضوعات کا انتخاب بہت چابک دستی اور حاضر دماغی سے کیا ہے۔ اس نے سماج اور شخصیت کے کانٹے چُن چُن کر ان میں فن کا پھول بنانے کی کوشش کی ہے۔

(مریخ (پٹنہ) مئی/۱۹۸۶ء)

☆تارا چرن رستوگی (گوہاٹی آسام)

قادری صاحب کے افسانوں کے خواب ''خواب پریشاں'' نہیں بنتے اور اسی لئے ان کے جمالیاتی ادراک میں غمِ دوراں کی کسک بھی ہے اور اس کسک کا سامنا کرنے کی تاب وتوانائی بھی ہے............

قادری افسانہ نگاری کے فن سے کما حقہٗ واقف ہیں۔عرفان ذات وحیات کے حامل، یہ افسانے منفرد مقام ومرتبہ کے افسانے ہیں۔ریاست بہار ہمیشہ سے افسانہ نگار پیدا کرتی رہی ہے۔بہت اپدیش، جاتک کتھائیں قبل مسیح اسی خطہ میں لکھی گئی ہیں۔

سیّد احمد قادری ہر اعتبار سے بہت بڑا افسانہ نگار ہے۔

(ماہنامہ ''انشاء'' (کلکتہ) فروری/۱۹۸۸ء)

☆ڈاکٹر وہاب اشرفی (رانچی)

قادری جو کچھ لکھ رہے ہیں، سوچ سمجھ کر لکھ رہے ہیں۔

(ترسیل'' جنوری/۸۹)

☆وارث علوی (احمد آباد گجرات)

مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کو قصہ گوئی کا طور ہاتھ آ گیا ہے اور مجھے خوف ہے کہ یہی چیز آپ کے لئے مُضر ثابت ہوگی۔یہ باتیں میں نہ لکھتا اگر آپ میں افسانہ نگاری کی صلاحیت نہ پاتا۔

(ماہنامہ ''ترسیل'' جنوری/۱۹۸۹)

☆ڈاکٹر علیم اللہ حالی (گیا)

سید احمد قادری کا موضوعاتی Range خاصا وسیع وعریض ہے۔ان کے افسانوں ''کنارہ دور'' ''اجنبی راہیں'' شہر خموشاں ''لمحوں کی بازگشت'' ''یادوں کا المیہ'' ''گمشدہ اُجالے'' اور ''قیدی'' وغیرہ کے ذریعہ جہاں موضوعاتی وسعت اور تنوع کا اندازہ

ہوتا ہے وہیں ان کا مخصوص اسلوب بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ بیانیہ پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ وہ الفاظ و علائم کی ساحری سے ہمیں لبھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ خارجی واقعات و واردات سے اخلاقی نکتے پیدا کر کے اپنی تخلیقات کی معنویت اور افادیت منوا لیتے ہیں۔ معاصر افسانہ نگاروں میں وہ اپنی انسانیت دوستی، اقدار نوازی، غایت سنجیدگی اور متانت کی وجہ سے صاف صاف پہچانے جاتے ہیں۔ کلام حیدری نے انہیں شہر افسانہ نگاری کا معزز شہری کہا ہے۔ ان کا یہ اعزاز متذکرہ بالا خصوصیات سے قائم ہوتا ہے۔

(۱۹۹۱ء کے افسانے)

☆ڈاکٹر عنوان چشتی (نئی دہلی)

''ریزہ ریزہ خواب'' کو پڑھ کر میں نے سید احمد قادری کے تخلیقی تجربوں میں شرکت کی اور اپنے ذہن وفکر کے نگار خانے میں ایسے مانوس جلوؤں کو رقصاں پایا جو ادبی روایت کی مخصوص خصوصیت سے ابھرتے ہیں۔

(ترسیل جنوری ۸۹ء)

☆ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی (مظفر پور بہار)

''ریزہ ریزہ خواب'' کے افسانوں میں ماجرا سازی بھی ہے مختلف انوع کر داروں کی پیکر تراشی میں بھی تا بمقدور احتیاط اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے اور ان افسانوں میں عصری اور سماجی زندگی کا شعور بھی موجزن ہے۔ ''شہر خموشاں'' کی نسرین ''آنگن کی بات'' کے وقار احمد ''سرخ جوڑے'' کی ثریا ''بند آنکھوں کا سپنا'' کے جاوید وغیرہ ایسے کر دار ہیں، جن میں کسی طرح کی اجنبیت نہیں ہے۔ یہ سب کے سب ہمارے معاشرے کی سرگرمیوں سے ابھرنے والے کردار ہیں۔

''فاصلہ قریب کا'' کی نصرت ''سسکتے لمحے'' کی شہلا اور ''خواب'' کے جاوید جیسے کردار اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سید احمد قادری کی قوت مشاہدہ میں باریکی ہے، وا

تعیت اور تیز حساسیت بھی۔ انہوں نے اپنے ان افسانوں میں سماجی حقائق کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کاوش کی ہے اور اس کاوش میں انہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔
(آجکل، جولائی/۱۹۸۶ء)

☆سرسوتی سرن کیف (بنارس)

Some people have branded Quadri as having a progressive orientation. I do not see any such thing in these pieces. Only three stories deal with financial problems, nine stories depict psychology in varied but commonly known situationis sort of monotony of style there is a great variety of situations and problems. It can be said that these stories cover as much of life as is possible in a single book.
(The Pioneer)

☆ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

سید احمد قادری نے تہہ بہ تہہ زندگی کو جس طور دیکھا، محسوس کیا اور بھوگا ہے، اسے بیانیہ طریقے سے افسانے کا روپ دیا ہے، آج کے سماج میں جو جبر ہے، دھوکہ، فریب، استحصال، ظلم، تشدد، انتشار، افراتفری، گھٹن، مایوسی اور مجبوری ہے اسے اپنے افسانوں کی معنویت بخشنے میں پیش کیا ہے۔

''ریزہ ریزہ خواب'' کے افسانوں میں منظم پلاٹ، نمایاں کردار، کہانی کے روپ میں کوئی خاص واقعہ اور وحدت زماں و مکاں کے ساتھ ایک مخصوص تاثر بھی پایا

جاتا ہے......!

(توازن، مالیگاؤں)

☆تاج انور (گیا)

سیّد احمد قادری صرف بیرونی مناظر پیش کرتے بلکہ محسوسات کے نہاں خانوں، کشمکش، پیچیدگی اور درد وکرب کی لہروں کو بھی سمیٹ کر اپنی انتہائی مشاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

(ماہنامہ ''ترسیل'' فروری/۱۹۸۶ء)

☆عثمان عارف (احمد آباد' گجرات)

سیّد احمد قادری کے اسلوب کو فیصلہ کن اسلوب یعنی Dicisive Style کے زمرے میں رکھنا پسند کروں گا۔ ان کا اسلوب' خیال میں اس طرح داخل نظر آتا ہے۔ گویا پھول میں رنگ اور خوشبو، وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اور اسی لئے کہیں تصنّع پیدا نہیں ہوتا۔

سید احمد قادری ایک سادہ، نرم دل، روشن دماغ، حساس طبیعت بیدار ذہن، درد مند فطرت اور صالح نظریات کے حامل ہیں، انہوں نے اپنی ان ہی خوبیوں کو بروے کار لا کر اپنے معیاری افسانوں سے اُردو زبان وادب کو مالا مال کر دیا ہے۔

☆شہنشاہ مرزا (لکھنؤ)

جب سید احمد قادری خالص بیانیہ انداز کے افسانے لے کر سامنے آئے تو تھوڑی تبدیلی کا احساس ہوا۔

(معلم اُردو' لکھنو اکتوبر/۱۹۸۷ء)

☆احمد حسین شمس (کشن گنج' بہار)

اکتوبر کے شمارہ میں ناگ پھنی کا ایک درخت نظر آیا۔ کیا پتے کی بات ہے کہ

''اس کا بیج اس دن لگایا گیا ہوگا، جس دن ہابیل اور قابیل کے درمیان جنگ ہوئی تھی'' اور اب تو یہ درخت آج کے دور میں بہت لہلہا اٹھا ہے۔ ہر شاخ ناگ کی دوشاخہ زبان۔

میں تزبزب میں ہوں۔ مبارکباداس درخت کودوں یاان لوگوں کو جواس درخت کی سرپرستی کی رہے ہیں۔

فی الحال میں آپ کے قلم ہی کو مبارکباد کہہ رہا ہوں کہ اس نے اس درخت کی نشان دہی کی ہے۔ سراغ اور دریافت بھی بڑا کام ہے۔ غضب کا افسانہ ہے۔

☆انجم آراء انجم (علی گڑھ)

......بات معیار کی نہیں بلکہ عالمی معیار کی ہے۔ اس کے علاوہ بات یہ بھی ہے کہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کے سارے افسانے میری نظر سے نہیں گزرے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ میری فہرست میں وہ افسانے رہ جائیں جو اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہوں۔ بہر حال یہ چند نام حاضر ہیں۔

ہاؤسنگ سوسائٹی (قرۃ العین حیدر) 'آخری آدمی' 'شہر افسوس' (انتظار حسین) تیسری ہجرت (اعجاز راہی) 'دریاؤں کی پیاس' بے محاورہ (جوگندر پال) 'مریم' جس تن لاگے (رتن سنگھ) 'رانی' (اقبال متین) 'بیساکھی' دو بھیگے ہوئے لوگ (اقبال مجید) لمحوں کی بازگشت (سید احمد قادری) 'انجام کار (سلام بن رزاق)' کابلی والا کی واپسی (انور قمر) 'گھونسلہ (شوکت حیات)۔

(ماہنامہ ''شاعر'' ہم عصر اردو ادب نمبر......صفحہ۔۷۵۹)

☆ڈاکٹر جاوید حیات (پٹنہ)

استحصال سید احمد قادری کا پسندیدہ موضوع ہے۔ چنانچہ اس کے مختلف روپ مختلف افسانوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

☆ڈاکٹر طارق فاطمی (پٹنہ)

سیّد احمد قادری کے افسانوں کا مطالعہ کیجئے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا فن ہمیشہ ارتقا پزیر رہا ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کے مشاہدے میں گہرائی اور باریکی کے ساتھ ترتیب ماجرا اور تعمیر عروج میں نفاست اور لطافت بھی پیدا ہوئی ہے۔

ان کے افسانوں میں غربت و افلاس کی چکی میں پستے ہوئے انسانوں کا کرب نمایاں ہے۔ ''بند آنکھوں کا سپنا''، ''سرخ جوڑے''، ''لمحے درد کے'' ایسے افسانے ہیں جن میں نفسات کی پراسدار تہیں اور زندگی کی متعدد الجھنیں پوری شدت سے موجود ہیں۔ جن کی وجہ سے ان افسانوں کے مطالعے کے دوران قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہیں اور اکثر افسانوں کے خاتمے پر پہنچ کر قاری چونک اُٹھتا ہے۔

(قومی آواز (پٹنہ) ۱۳، اپریل ۱۹۸۶ء)

☆قیصر جمال (بھاگلپور)

''ریزہ ریزہ خواب'' کے افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی قادری نے اپنے افسانوں کا رشتہ کہانی پن سے جوڑے رکھا ہے اور مشاہدہ و فکر کے ذریعہ اپنے بیانیہ افسانوں میں Force پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔ اس مجموعہ کے زیادہ تر افسانے سماجی اور اخلاقی پستی، غربت اور مفلوک الحال انسانوں کی زبوں حالی جنسی استحصال وغیرہ جیسے ترقی پسندانہ مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ ''بند آنکھوں کا سپنا'' اور ''قیدی'' اقتصادی بدحالی پر کامیاب افسانے ہیں۔

(اندیشہ (بھاگلپور) جنوری ر ۱۹۸۷ء)

☆☆☆☆☆

بازگشت: "دھوپ کی چادر" کی

- شمس الرحمٰن فاروقی
- عبدالمغنی
- محمد مثنیٰ رضوی
- معین شاہد
- علیم اللہ حالی
- مناظر عاشق ہرگانوی
- محمد محفوظ الحسن
- رضوان احمد
- نامی انصاری
- ارتضیٰ کریم
- سید ظفر ہاشمی
- قمر جہاں
- اسلام عشرت
- ممتاز احمد خاں
- نثار احمد صدیقی
- رخسانہ سلطانہ
- شیریں اختر

- Asghar Ali Engineer
- M. Q. Khan
- Rafia Kazim

☆شمس الرحمن فاروقی (الـــــہ آبــاد)

سیّد احمد قادری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے افسانہ میں وقت بے وقت چلنے والی ناخوشگوار ہواؤں سے خود کو محفوظ رکھا۔ پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ قادری کامیاب صحافی ہیں اس لئے ان کے افسانے کبھی کبھی صحافت کے نزدیک ہوجاتے ہیں۔ یہاں پر مجھے یہ شک گزرتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کہنے والے نے جس چیز کو جہاں افسانہ میں وقت بے وقت چلنے والی ناخوشگوار ہوا سے تعبیر کیا ہے اگر وہ ہوا قادری کے افسانوں میں بہتی رہتی ہے تو ان کے افسانے صحافت سے قریب ہونے بجائے دور رہتے۔

سچی بات یہ ہے کہ قادری کے افسانوں کے بارے میں سرسری رائے ہمیشہ غلط ثابت ہوں گی اور وہ رائیں بھی غلط ثابت ہوں گی جنہیں افسانے کی تنقید کے ایک مخصوص فارمولے کے تحت گڑھا گیا ہوا۔ سیّد احمد قادری زبان کا شعور رکھتے ہیں اور مکالمے کے آہنگ سے آشنا ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں واقعیت اور شعریت کا فوری احساس ہوتا ہے ان افسانوں میں معاصر دینا کا رنگ جگہ جگہ جھلکتا ہے لیکن معاصر دنیا یہاں اجنبی یا زبردستی بلائے ہوئے مہمان کی طرح نہیں بلکہ گھر کے معزز فرد کی طرح نظر آتی ہے، ایسا فرد جو اپنے وجود کا احساس دھوم دھڑا کے سے نہیں بلکہ خاموش طنزیہ مسکراہٹ کے ذریعہ لوگوں پر قائم کرتا ہے، افسانہ ''دلدل'' اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ شہرت اور دولت کا جال آج ہمارے معاشرے کو جس طرح جکڑے ہوئے ہے وہ بعض افسانوں مثلاً ''مایا جال'' اور ''تشویش'' میں خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

(اثبات ونفی، کلکتہ)

☆عبد المغنی (پٹنہ)

''دھوپ کی چادر'' سید احمد قادری صاحب کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے پہلے افسانے میں امیروں کے مظالم کے خلاف غریبوں کی اس دہشت گردی کا قصہ ہے جس کے مظاہر افسانہ نگار کے اپنے دیار ضلع گیا کے مضافات میں عام ہو رہے ہیں۔ اس میں

دکھایا گیا ہے کہ کس طرح عوام سرکاری عدالت سے مایوس ہو کر دہشت گردوں کی عدالت سے رجوع کر رہے ہیں اور اس کے فیصلے خوں ریز تشدد کا ایک چکر چلا رہے ہیں۔ آخری افسانے میں بھی وقت کی ایسی ہی ایک تلخ سماجی حقیقت کی کہانی ہے جس کا ماجرا یہ ہے کہ پرانی نسل کے لوگ اپنی نئی نسل کی بدسلوکیوں سے مایوس و مجروح ہو کر المناک داستانوں کو جنم دے رہے ہیں۔ یہ دونوں مسائل حاضرہ ہیں اور ان سے افسانہ نگار کی عصری حسیت کا پتہ چلتا ہے۔

سید احمد قادری صاحب کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ باماجرا افسانے ہیں جن میں قصے کی دلچسپی پائی جاتی ہے اور تجریدی انشا پردازی کی بکواس نہیں ہوتی۔

(مریخ، پٹنہ)

☆محمد مثنیٰ رضوی (گیا)

سیّد احمد قادری کی کہانیوں میں موضوعات کا تنوع ہے لیکن اُن کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے موضوعات کو اس انداز میں چھوا اور برتا ہے کہ وہ فنی وحدت کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ تاثر کی وحدت اور لفظوں کا محتاط انتخاب ان کے افسانوی تار و پود کو بکھرنے نہیں دیتا۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''اپنی عدالت'' آج کی زندگی کی ایک ایسی حقیقت ہے جس نے پورے معاشرے کو لپیٹ رکھا ہے طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں کھیلا جانے والا آگ اور خون کا یہ کھیل جو بھیانک روپ اختیار کر چکا ہے، اس کہانی کا موضوع ہے۔ دو تین کہانیاں اس نوع کی اور ہیں لیکن ''اپنی عدالت'' کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اُن کی کہانیوں میں مسلّمہ سماجی اور تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کا مسئلہ بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ''خلیج''، ''ریت کی دیوار'' اور ''اولڈ پیپلس ہوم'' ایسی ہی کہانیاں ہیں جن میں مادّی خوشحالی کے حصول کی دوڑ میں کھوکھلی اور دکھاوٹی زندگی کے پیچھے بھاگتے ہوئے لوگ بے بسی اور بے چارگی کی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ حیران، پریشان اور سراسیمہ۔ اس ڈگر سے قدرے ہٹی ہوئی کہانی ''خاموش سایہ'' ایک ایسی نفسیاتی الجھن کا مطالعہ ہے جسے ہم

حد سے زیادہ بڑھی ہوئی انا کا نتیجہ مان سکتے ہیں مگر احمد قادری نے اس کہانی میں بھی سماجی حقائق سے اپنا رشتہ استوار رکھا ہے اور اسے معاشرتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔

سیّد احمد قادری افسانوی فن کے لوازمات اور تقاضوں سے اچھی طرح باخبر ہیں۔

(ایوان اردو، دہلی)

☆معین شاھد (گیا)

سیّد احمد قادری کے دوسرے افسانوی مجموعہ "دھوپ کی چادر" کی کہانیوں میں زندگی کی حرارت اور شریانوں سے بہتے ہوئے خون کے جیسی گرمی بھی ہے۔ اور دھوپ کی وہ روشنی بھی، جو اندھیروں کو چیر کر کرۂ ارض پر سایہ فگن ہوتی ہے۔ اور جو مایوسیوں، محرومیوں، رنجوریوں میں زندگی کو ایک نئی تازگی اور نمو بخشتی ہے۔ قادری شہر افسانہ نگاری کا صرف معزز شہری ہی نہیں بلکہ وہ دیہاتیوں کی جھونپڑیوں، کھلیانوں اور غریب و مظلوم انسانوں کے جزبات احساسات کا بے باک ترجمان بھی ہیں۔ جو بڑے زمینداروں اور چودھریوں کے استحصال کے شکار رہے ہیں۔ ان کی نگاہ بہت گہری، مشاہدہ بہت تیز اور فکر، بہت بالیدہ ہے۔ وہ معمولی سے معمولی جزئیات کو اپنے فن کی گرفت میں اس طرح لاتے ہیں کہ قاری کے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں، وہ موضوع کی داخلیت اور خارجیت سے پوری طرح کما حقہ آشنا ہیں، وہ فن افسانہ نگاری کے رموز و اسرار سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ اسے برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ وہ تجریدیت اور نا آشنا علامتوں اور گنجلگ تشبیہوں اور استعاروں کے بھول بھلیوں میں اپنے قاری کو نہیں الجھاتے، بلکہ وہ اپنے سیدھے سادے اسلوب بیان اور اپنے مئوثر پیرایہ اظہار کے ذریعہ ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ بات دل میں اتر جاتی ہے۔

(آدرش، گیا)

☆علیم اللہ حالی (گیا)

سیّد احمد قادری گزشتہ دس برسوں میں REALITY

CRUDE کو PALATABLE بنانے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں اس میں بہت حد تک کامیابی بھی ملی ہے۔ اپنے افسانوں کے تھیم اور TREATMENT کے ذریعہ وہ اس کا ثبوت بھی دیتے رہتے ہیں۔

دھوپ کی چادر میں کل ۲۰ا فسانے ہیں بہت سخت معیار بھی رکھا جائے تو ان میں کم سے کم ۸ افسانے ایسے ضرور ہیں جن کا ذکر ہوسکتا ہے اور جن کی تخلیق سیّد احمد قادری کو خوش ہونا چاہئے۔ ممکن ہے یہ میری ذاتی پسند ہو، دوسروں کو کچھ اور افسانے اچھے لگیں اور تعداد میں بھی زیادہ ہوں بہر حال میں بہت معروضی انداز میں مطالعہ کرتے ہوئے اس مجموعے میں ''ریت کی دیوار''، ہنسانے والے، دلدل، مایا جال، زنجیر، ایک سچوئیشن، اولڈ پیلیس ہوم اور کسی حد تک افسانہ ''تشویش'' کو سیّد احمد قادری کی نمائندہ تخلیقات تصور کرتا ہوں۔ ان سے قادری کے قدو قامت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ان کے فکر و نظر کا بھی۔

افسانہ ''ریت کی دیوار'' اقتصادی کشا کش اور بیروزگاری کے موجودہ ماحول میں انسانی و اخلاقی اقدار کی پامالی کی ایک چونکا دینے والی کہانی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ ایک حقیقت ہے جسے کہانی کا روپ بخش دیا گیا ہے۔

سیّد احمد قادری ٹھوس وقوعوں سے حسی لہر پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کی متزکرہ بالا تمام کہانیوں میں یہ خوبی موجود ہے، ان کی کہانیاں با لعموم ایک اچانک DROP-SCENE ختم ہوتی ہیں۔ اور اپنے پیچھے ایک تا دیر رہنے والا PATHOS چھوڑ جاتی ہیں۔

فنی حسن کی افزائش، مشاہدے کی وسعت، فکر و نظر کی گہرائی اور تاثر کی شدت کے لحاظ سے سید احمد قادری نے ''ریزہ ریزہ خواب'' اور ''دھوپ کی چادر'' تک ایک لمبا سفر طے کیا ہے، منزل بہ منزل ان کی پہچان مضبوط بنتی جا رہی ہے۔ یہ سفر کہاں ختم ہوگا نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اسے کبھی ختم نہیں ہونا چاہئے۔

(سہیل، گیا)

☆مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور)

اس مجموعہ میں سیّد احمد قادری کے بیس۲۰ افسانے شامل ہیں۔''اپنی عدالت'' ''ریت کی دیوار''''خلیج''''غرت دار''''آئینے کی گرد'' ''ہنسانے والے'' ''تشویش'' ''دلدل''''انقلاب'' ''کوئی صدانہیں'' ''ہم قدم'' ''اشاروار'' ''مایاجال'' ''زنجیر'' ''دوپہر'' ''خاموش سایہ'' ''سائے کا تعاقب'' ''ایک پچویشین'' ''آگ سے روشنی'' اور ''اولڈ پیپلس ہوم''میں تہہ بہ تہہ زندگی ملتی ہے جو تجربے اور مشاہدے سے تپ کر بیانیہ افسانے کا روپ دھارتی ہے۔آج کے سماج میں جو جبر ہے،دھوکہ،فریب،استحصال،ظلم، تشدد، انتشار، افراتفری، گھٹن، مایوسی اور مجبوری ہے، اسے سید احمد قادری نے اپنے افسانوں میں گہری معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے افسانوی کردار کسی سوچے سمجھے موضوع کی روشنی میں حالات اور ماحول کے زیراثر آہستہ آہستہ ڈھلتے ہیں اور افسانے کے خاتمے پر قاری کو واقعے کی کیفیت کا اندازہ ہو پاتا ہے۔ایسے افسانے جگمگاتی ہوئی سچائیوں کے پیچھے نہایت مکروہ اور منافق حقیقتیں رکھتے ہیں۔مجموعہ کی پہلی ہی کہانی ''اپنی عدالت'' خود میں بڑی توانائی رکھتی ہے۔

سیّد احمد قادری کے دیگر افسانے بھی شعوری طور پر ایسی ہی نئی جہتیں رکھتے ہیں۔ وہ گردوپیش کی کائنات کو نہایت غیر جانبداری اور سردمہری سے دیکھتے اور برتتے ہیں اور اسی میں ان کی افسانوی انفرادیت پوشیدہ ہے۔

(زبان وادب،پٹنہ)

☆محمد محفوظ الحسن (گیا)

''دھوپ کی چادر'' سیّد احمد قادری کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ سید احمد قادری نے بڑی چابکدستی سے ان واقعات اور حادثات کو زبان دی ہے اور موضوع اظہار بنایا ہے جو بظاہر معمولی نظر آتے ہیں لیکن جن کے اثرات انتہائی غیر معمولی ہیں۔ سید احمد قادری

نے مشاہدات کو تجربات کی بھٹی میں تپایا ہے تب کہیں یہ کندن بنے ہیں۔

موجودہ عہد کی سچائیاں اور کڑواہٹیں، زندگی اور سماج کے بدلتے رجحانات، پرانی قدروں کی شکست خوردگی کا احساس، عصر حاضر کی چکاچوند میں صدیوں کی تہذیبی اور اخلاقی روایات کی پسپائی سید احمد قادری کے افسانوں کے بنیادی موضوعات ہیں۔انہوں نے کھلی آنکھوں سے آج کی ننگی حقیقت کو دیکھا ہے اور کہانی کے روپ میں ڈھالا ہے۔آنکھیں کھلی ہوں، دیدہ و دل حساس ہوں اور شعور بالیدہ ہو تو ہر لمحہ ایک کہانی ہے۔

''دھوپ کی چادر'' کے بیشتر افسانے مفلسی، استحصال، فرقہ واریت، دہشت گردی (اسباب و نتائج) ظلم و بربریت کی بے باک کہانی سناتے ہیں، دم توڑتی ہوئی خواہشیں، ظلم و جبر کے خواب میں مظلوموں کی یکجا، ہوس زر اور اخلاقی گراوٹ، رشتوں کا بدلاؤ، انسانیت کا نوحہ ان کے افسانوں میں بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں، کہانی کا تانا بانا بنتے وقت احمد قادری کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انہیں کہانی کہنے کا فن اور ماجرا سازی کا گر معلوم ہے۔''

(آجکل، دہلی)

☆رضوان احمد (پٹنہ)

میں سید احمد قادری کے افسانے گزشتہ بیس برسوں سے پڑھ رہا ہوں، بلکہ ان کا سب سے پہلا افسانہ میں نے ہی اپنے رسالہ ''زیور'' میں شائع کیا تھا، اس کے بعد سے ان کا ادبی سفر مسلسل جاری ہے۔

''دھوپ کی چادر'' قادری کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے اس سے قبل ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ریزہ ریزہ خواب'' کے عنوان سے دس سال قبل شائع ہوا تھا۔اس مجموعے میں بیس افسانے ہیں ظاہر کہ کسی بھی افسانہ نگار کے تمام افسانے اچھے یا اعلیٰ پائے کے نہیں

ہوتے۔اسی لئے ان بیس کہانیوں میں نصف ایسی ہیں جن کو اچھا یا معیاری کہا جا سکتا ہے اور نصف بھرتی کی ہیں لیکن ایک تخلیق کار اگر اپنی زندگی میں دو چار بھی بڑی کہانیاں لکھ دے تو اس کے لئے وہی بہت اہم ہے قادری کے یہاں کئی اچھی کہانیاں ملتی ہیں۔اس مجموعے میں بھی ''اپنی عدالت''، ''ریت کی دیوار'' ''ہنسانے والے'' ''دلدل'' اور ''زنجیر'' جیسی بھرپور اور مکمل اور اعلیٰ پائے کی کہانیاں موجود ہیں جن کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن پر زبردست تأثر مرتسم ہوتا ہے اور وہ بہت دنوں تک ان کہانیوں کو بھول نہیں پاتا۔

سید احمد قادری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بہت معمولی موضوعات پر کہانیاں لکھتے ہیں ایسے موضوعات پر لکھتے ہیں جو ہماری آپ کی نظر سے روزانہ گزرتے ہیں اور ان کی کہانی پڑھنے کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ جیسے یہ واقعہ دیکھ کر اپنے ذہن میں بھی ایسا ہی ردعمل ہوا تھا اس سنے یا اس واقعے کے مشاہدے کے وقت ہم نے بھی ایسا ہی سوچا تھا۔ وہ بالکل عام واقعات اور چھوٹی باتوں کو اخذ کر کے ان کو اپنے ذہن کی بھٹی میں تپا کر ایک تخلیقی فن پارہ بنا دیتے ہیں۔

ان کے کرداروں کی سچائی ہی ان کے افسانوں کا کھرا پن ہے ان کی صداقت اور ان کے فن پاروں کی چمک ہے جہاں سچائی ہوگی اس کی خوشبو خود بخود آپ تک پہنچ جائے گی یہی سبب ہے کہ سید احمد قادری کے افسانوں کی صداقت کا عنصر ان کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے اور یہ ایسا وصف ہے جس سے ان کی کہانی کی شناخت ہوتی ہے۔ان کی کہانی بھیڑ میں بھی پہچانی جا سکتی ہے۔ یہ بہت بڑی بات یہ کہ انہوں نے دو دہائیوں کے اندر اپنا ایسا اسلوب اور لب ولہجہ بنالیا ہے جو ان کی آپ شناخت کرواتا ہے۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ برسہا برس تک لوگ انفرادیت کی تلاش میں سر پٹکتے رہتے ہیں مگر اس کا حصول نہیں ہو پاتا ہے افسانے لکھنا اور بات ہے اور علیحدہ شناخت بنانا بالکل الگ بات ہے۔وصف بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔قادری کے یہاں احساس کی لپک بڑی تیز ہے وہ اپنے احساسات کی ترسیل میں پورے طور پر کامیاب ہیں۔کیونکہ

انہوں نے کہیں بھی علامت یا تجرید کے گورکھ دھندے میں الجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی قاری کا الجھانے کی کوشش کی ہے۔

(ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ اکتوبر ۹۷ء)

☆نامی انصاری (کانپور)

سیّد احمد قادری کے بیس افسانوں کا مجموعہ دھوپ کی چادر ان کے فکروفن کی نمائندگی کرنے کے ساتھ، ساتھ اس خاص علاقے کے احوال و آثار کی بھی نمائندگی کرتا ہے جس سے مصنف کی ذہنی اور جزباتی وابستگی استوار ہے کیوں کہ یہ اس کی جنم بھومی کا علاقہ ہے۔

اس کتاب کا پہلا افسانہ ''اپنی عدالت'' اگر ایک طرف انصاف اور انتقام کی دلدوز کہانی سُناتا ہے تو دوسری طرف ایک ایسی پراسرار طاقت کی نشان دہی بھی کرتا ہے جس نے دبے کچلے لوگوں کو انصاف دلانے کے لئے اپنی ایک متوازی عدالت اور پولس قائم کر رکھی ہے۔ جہاں سے کوئی ظالم بچ کر نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح ''ریت کی دیوار'' بھی ایک ایسی سماجی ناانصافی کا منظر نامہ پیش کرتا ہے جہاں محض نوکری حاصل کرنے کے لئے ایک نوجوان اپنے جیتے بابا کا گلا دبا دیتا ہے۔ اس افسانے میں جو نفسیاتی گرہ ہے، اس کو افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔

ان افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید احمد قادری اپنے گرد و پیش کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور سماج میں دور دور تک پھیلی ہوئی بے بسی، لاچاری اور ناانصافی کے سیاہ نقوش کو بڑی سہولت سے اپنے قاری کے سامنے اُجاگر کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانے سیدھے سادے بیانیہ انداز کے ہیں۔ لیکن ان کا اختتامی فقرہ تصورات کو اُبھا کر پورے افسانے کا جواز پیش کر دیتا ہے۔

(نیا دور، لکھنو)

☆ارتضیٰ کریم (نئی دھلی)

سیّد احمد قادری نے ''جہانِ افسانہ'' میں وقت بے وقت چلنے والی ناخوشگوار بے ہنگم اور تیز و تند ہواؤں سے خود کو ہمیشہ محفوظ رکھا اور کہانی کے بعض بنیادی تقاضوں پر بڑی سختی سے قائم رہے۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی جب ان کے معاصر افسانہ نگار قبل از وقت شناخت کے چکر میں علامتوں اور تجریدوں کی بیساکھی تلاش کرنے میں ایسے گم ہوئے کہ اپنے ''امکانات'' بھی کھو بیٹھے مگر یہ خشوع خضوع کے ساتھ پریم چند کی مستحکم افسانوی روایت سے جڑے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو افسانوی ادب میں کئی گراں قدر اضافے کرنے میں کامران رہے۔ ان کے افسانوں کی بنیادی شناخت تجربے، مشاہدے، حادثات اور واقعات کو غیر معمولی سادگی سے بیان کرنا ہے۔ نیز ان کے افسانوں میں ''کہانی پن'' یا ''افسانویت'' کا احساس لگاتار قائم رہتا ہے۔ ''دھوپ کی چادر'' کے کئی افسانے عصرِ حاضر کے نوحے بھی ہیں اور کامیاب فن پاروں کے نمونے بھی۔

☆سید ظفر ھاشمی (احمد آباد)

سیّد احمد قادری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ریزہ ریزہ خواب'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ ''دھوپ کی چادر'' دس سال بعد منظر عام پر آیا ہے۔ سید احمد قادری ایک فعال صحافی اور معتبر قلم کار ہیں انہوں نے اردو افسانے کو تجریدیت کے عذاب سے نکالنے میں عصری افسانہ نگاروں کو بھرپور تعاون دیا ہے۔ بیشتر لوگوں کی طرح انہیں بھی اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ پچھلی دہائیوں میں علامتی استعاراتی اور تجریدی اظہار نے اردو افسانوں کو قاری سے بہت دور کر دیا تھا، اس کا احساس اب ان کو بھی ہو گیا ہے جو اس بے راہ روی اور کجروی کے شکار ہوئے تھے، اور ذہنی پروازوں کے زعم میں آ کر یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ بہت بڑا ادب پیدا کر رہے ہیں۔ انہیں جب پتہ چلا کہ ان کے افسانے ان ہی ٹائپ کے پرور ناقد ہی پڑھتے ہیں اور چیونٹی کے بل میں ہاتھی گھسیڑنے اور گدھا نکالتے

ہیں تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور وہ حقیقت بیانی اور کہانی پن کی طرف رجوع ہونے لگے۔ سید احمد قادری کبھی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوئے انہوں نے اپنے افسانوں میں کہانی سے تعلق بنائے رکھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

قادری کے افسانوں کے کردار حالات اور واقعات حقیقی لگتے ہیں۔ قادری محیر العقول باتیں نہیں کرتے جو عام آدمی کہنا چاہتا ہے وہی وہ کہتے ہیں جو عام آدمی دیکھتا محسوس کرتا اور بھوگتا ہے وہی وہ افسانوں میں بیان کرتے ہیں اس لئے ان کے افسانے سچے اور کھرے لگتے ہیں وہ سیدھے سادے الفاظ میں کہانی کہتے ہیں نہ الجھاؤ نہ تکرار نہ معمہ نہ گتھی نہ تہہ داری کی پرت پرت اکھاڑنا پڑے اور آخر میں ہاتھ کچھ نہ لگے۔

(گلبن احمد آباد دسمبر ۹۶ء)

☆ قمر جہاں (بھاگلپور)

سید احمد قادری افسانوی ادب کا ایک مشہور و معروف نام ہے ''دھوپ کی چادر'' ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ''ریزہ ریزہ خواب'' کے افسانے خاصے مشہور ہو چکے ہیں اور ان افسانوں کے حوالے سے کلام حیدری (مرحوم) نے سید احمد قادری کو شہر افسانہ نگاری کا ایک معزز شہری کا اعزاز بخشا ہے۔ شہر افسانہ نگاری کے اس معزز شہری نے ''دھوپ کی چادر'' میں کل ۲۰/ افسانہ پیش کیئے ہیں ''ریزہ ریزہ خواب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صغر علی انجینئر کے الفاظ تھے۔

''ان میں بعض کہانیاں کمزور ہیں بعض بہت اچھی بھی ....'' ''دھوپ کی چادر'' میں اچھی کہانیوں کا پلہ بھاری ہے ان میں ''ریت کی دیوار'' ''اپنی عدالت'' سائے کا تعاقب'' ''اولڈ پیلس ہوم'' ''عزت دار'' ایک سچویشن'' ''مایا جال'' وغیرہ کا شمار یقیناً سید احمد قادری کی اچھی اور کامیاب کہانیوں میں ہوگا۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے لئے جو موضوعات منتخب کیے ہیں وہ وہی ہیں جو ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں سماج کے وہ مسائل بھی ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کو انتہائی قبیح بنا دیا ہے۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ قادری

نے افسانہ کو محض تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک ادب کا ایک واضح مقصد ہے شاید اسی لئے ان کے افسانوں میں مقصدیت کی جھلک بے حد نمایاں ہے۔ بسا اوقات فن کی نزاکت کے لئے یہ چیز گراں بار بھی بنی ہے لیکن عام طور پر فن اور مقصد کی خوشگوار ہم آہنگی ملتی ہے۔ ماجرا نگاری، کردار کی تشکیل اور اظہار و بیان کی صفائی و بے باکی میں سید احمد قادری نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

(کتاب نما، دہلی۔ جنوری ۹۷ء)

☆ اسلام عشرت (پٹنہ)

''دھوپ کی چادر'' میں جتنے افسانے شامل ہیں بلا شبہ ان افسانوں کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد چند در چند جہات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سبھی افسانے مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس مجموعے کے تمام افسانے مختصر سیدھے سادے، دل چسپ موثر، حسین و دل کش، فن کار کے نجی تجربات، محسوسات اور مشاہدات کے آئینہ دار ہیں اس مجموعے کا کوئی بھی افسانہ علامات یا استعارات یا تجریدیت کے بوجھ تلے دبا ہوا نہیں ہے۔ البتہ ان کے چند افسانوں میں شاید لاشعوری طور پر ان کا صحافتی انداز (سید احمد قادری ایک بے باک دو یانت دار صحافی بھی ہیں) در آیا ہے جو افسانوں کے لئے ناموزوں و نامناسب ہے۔ یقین ہے آیندہ قادری اس امر کو ملحوظ رکھیں گے۔ ہمیں ان سے بے حد توقعات ہیں۔ ان کے اس مجموعے میں بیانیہ اسلوب جو میرے خیال میں انہیں ان کے معاصرین میں ممیز و ممتاز بناتا ہے، وہ شروع سے اخیر تک موجود ہے۔ چنانچہ بہ حثیت مجموعی میں یہ کہنے میں یقینی حق بہ جانب ہوں کہ زیر تذکرہ مجموعہ مواد و موضوع، فکر و سنجیدگی، وسعت و تنوع، افسانے کی تکنیک و فن، غیر تصنع پسندی، سادگی و پرکاری، فن کارانہ چابکدستی، مخصوص و منفرد اسلوب اور معنی خیزی کے اعتبار سے محض قابل اعتناء ہی نہیں۔ بلکہ قابل قدر و لائق مطالعہ بھی ہے۔

☆ممتاز احمد خاں (مظفر پور' بہار)

سیّد احمد قادری کے افسانے پڑھ کر صاف طور پر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ انسانوں کے دکھ درد مصائب والائم کو اپنا موضوع بناتے ہیں غریبوں محنت کشوں اور دکھ درد کے مارے ہوئے لوگوں کی زندگی ان کو متاثر کرتی ہے۔اور ان کے قلم کو حرکت دیتی ہے۔ قادری کے افسانوں کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بھر پور قصہ پن پایا جاتا ہے۔قادری روزمرہ کے واقعات وسانحات اور گردوپیش کے احوال ومسائل کو افسانے کے قالب میں ڈھال دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ان کے افسانے علامتوں اور مبہم تجریدیت کا شکار نہیں ہوتے ان کے افسانوں میں سیدھے سادے اور سامنے کے مسائل اور روزمرہ کے تجربات وواقعات بڑی سادگی اور خلوص کیساتھ بیان ہوتے ہیں۔

قادری گردوپیش کے بدلتے ہوئے حالات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ہمارے یہاں سماجی اور سیاسی سطح پر جو تغیرات رونما ہورہے ہیں۔وہ ان کا بھی ادراک رکھتے ہیں۔دبے کچلے لوگوں کے اندر بیداری کی جو لہر اٹھ رہی ہے اس کی بھی عکاسی ان کے بعض افسانوں میں ملتی ہے اس سلسلے میں افسانے''اپنی عدالت''اور ''انقلاب''پیش کئے جاسکتے ہیں۔ بعض افسانوں میں طنز وتنقید کا لہجہ بھرہوا ہے۔معاشی نابرابری سماجی ناانصافی اور عوام کے اندر اٹھنے والی بغاوت اور بیداری کی لہر کئی افسانوں کا موضوع بنے ہیں۔افسانہ''دوپہر''اور ''ہنسانے والے''غربت اور پسماندگی کے مارے انسانوں کے احساسات ومسائل کی نہایت عمدہ ترجمانی ہے۔

سیّد احمد قادری جھوٹی مذہبیت کو بھی اپنے طنزیہ تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔افسانہ ''تشویش''کے قاسم بھائی مذہبی بھی بہت ہیں لیکن رشوت لینے میں بھی ماہر ہیں۔افسانہ ''آگ سے روشنی''فرقہ وارانہ ذہنیت اور اس کے بھیانک اور عبرت ناک نتائج کی بڑی موثر ترجمانی وعکاسی ہے۔

زیرنظر مجموعہ کے پانچ افسانے تو نا قابل فراموش ہیں انہیں اس مجموعہ کے بہترین

افسانوں میں شمار کرنا چاہئے (۱) اپنی عدالت (۲) عزت دار (۳) تشویش (۴) دوپہر (۵) اولڈ پیپلس ہوم۔ ان کے علاوہ "خلیج" "ہنسانے والے" اور "آگ سے روشنی" بھی کامیاب افسانے ہیں۔

سیّد احمد قادری ایک بے باک ادیب اور صاف گو فنکار ہیں وہ ادب کا کوئی افلاطونی نظریہ نہیں رکھتے بلکہ ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ قادری نے جیسا کہ خود اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس زمانے میں افسانہ نگاری شروع کی جب اردو افسانے پر علامت اور تجریدیت کا غلبہ تھا چیستانی اور نا قابل فہم افسانے لکھنا فیشن میں داخل تھا۔ قادری نے افسانہ نگاری کے اس مقبول وعروج رجحان سے الگ ہٹ کر پورے اعتماد سے پریم چند کرشن چندر وغیرہ کی مستحکم افسانوی روایت کو آگے بڑھایا۔

قادری کا اسلوب سادہ شگفتہ بے ساختہ اور برجستہ ہے اس میں کہیں تکلف وتصنع کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ وہ فطری انداز میں بے تحاشا اور بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی نثر مربوط اور آئینے کی طرح شفاف ہے خواہ مخواہ جملے تراشنے اور عبارت کو سجانے کی کوشش کہیں نظر نہیں آتی ہے۔

(جدید اسلوب' سہسرام)

☆نثار احمد صدیقی (ممبئی)

"دھوپ کی چادر" میں بھی افسانوں میں ایک سوال ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے...... میں کون ہوں؟ نئی روشنی کہاں ہے؟ اور پھر آج کا انسان خود سے بے خبر کیوں ہے؟ افسانہ "انقلاب" میں وہ روشنی تلاش کی جا سکتی ہے جس میں دیہی علاقوں میں آئے انقلابات کی عمدہ تصویر کشی ہے۔ "ریت کی دیوار" میں آج کی تلخ سچائی چھپی ہوئی ہے۔

افسانہ "تشویش" آج کے افسروں میں رشوت کی بڑھتی ہوئی وبا پر ایک بھرپور طنز ہے۔ "دلدل" میں افسانہ کا آخری جملہ چونکا دیتا ہے جو عہد حاضر کے سماج کی کریہہ تصویر کو پیش کرتا ہے...... "لو ماں' ہم تمہارے لئے گاہک لے آئے" افسانہ نگار نے بڑی فنکاری

سے صرف ایک جملہ میں کہانی کو آفاقیت بخش دی ہے۔ افسانہ کوئی صدا نہیں فساد کے موضوع پر بہترین کہانی ہے جو کامیاب ہے۔ ''خاموش سایہ'' میں ایک اردو افسانہ نگار وصحافی کی انا کی داستان ہے جسے پڑھ کر کلام حیدری کے علاوہ مجاز کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کہانی کے اسلوب کا جواب نہیں۔ اس کے علاوہ ''مایا جال'' ''ہم قدم'' سائے کا تعاقب ''عزت دار'' ''ہنسانے والے'' اُسٹاروار'' اور ''اولڈ پیلیس ہوم'' بھی مختلف موضوعات پر دلچسپ اور معیاری افسانے ہیں۔ جن سے اس مجموعے میں رنگا رنگی اور تنوع پیدا ہوا ہے۔

''دھوپ کی چادر'' پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سید احمد قادری کے پاس سماجی شعور فنی وفکری بصیرت اور منفرد اسلوب کے ساتھ ساتھ موضوعات کا تنوع بھی ہے، جو ان کی نمایاں پہچان ہے۔ بہت کم عرصے میں سید احمد قادری' آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں میں اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہیں۔

مجموعی طور پر ''دھوپ کی چادر'' افسانوی ادب میں ایک دلکش اضافہ ہے۔

(انقلاب' ممبئی)

☆ رخسانہ سلطانہ (گلبرگہ' کرناٹک)

سیّد احمد قادری کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے اور خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات کو جس سلیقے سے برتا ہے وہ فنی وحدت کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ اس مجموعہ کا پہلا افسانہ ''اپنی عدالت'' آج کی زندگی کی ایسی حقیقت ہے جو پورے معاشرے پر اثر انداز ہو رہی ہے طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں جو تلخ حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں اس کا بھیانک روپ اس کہانی کا موضوع ہے۔ دو تین افسانے اسی نوعیت کے ہیں۔ لیکن ان تمام افسانوں میں ''اپنی عدالت'' اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ سید احمد قادری کے افسانوں میں سماجی تہذیبی اقدار کی شکست وریخت کا مسئلہ بھی مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ''خلیج'' ''ریت کی دیوار'' ''عزت دار'' اور ''اولڈ پیلس ہوم'' ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ جس میں مادّی خوشحالی کے حصول کی دوڑ میں کھوکھلی اور بناوٹی زندگی کے

پیچھے بھاگتے ہوئے لوگ بے بسی اور بے چارگی کی صورت حال سے دو چار ہیں۔ان مو ضوعات سے علیحدہ ایک افسانہ ''خاموش سایہ'' ایک ایسی نفسیاتی الجھن کا اظہار ہے جسے ہم حد سے زیادہ بڑھی ہوئی اَنا کا نتیجہ مان سکتے ہیں۔سید احمد قادری نے اس افسانہ میں بھی سماجی حقائق سے اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے اور اسے معاشرتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔

سیّد احمد قادری کے دوسرے افسانے مثلاً تشویش'' ''ریت کی دیوار'' ''عزت دار'' ''خلیج'' مایا جال'' خاموش سایہ'' ''آئینے کی گرد'' ''دلدل'' وغیرہ میں جیتے جاگتے اور ہمارے اردگرد کے کردار ہی نظر آتے ہیں۔ان کے حرکات وسکنات ان کی زبان اور ان پر گزرے ہوئے ہوئی واردات دِکھائی دیتے ہیں۔یعنی سید احمد قادری کے افسانوں کے مطالعے کے بعد یہ افشاں ہوتا ہے کہ ان کے کردار حقیقی اور سچے ہیں۔

☆شیریں اختر (کولکتہ)

سیّد احمد قادری نے ''دھوپ کی چادر'' کے متعدد افسانوں میں عصری زندگی کے کسی نہ کسی اہم پہلو اور عوام کے دکھ درد کی حساس اور فنکارانہ تصویر کشی کی ہے۔مثلاً مجموعہ کا پہلا افسانہ ''اپنی عدالت'' جس میں جاگیردارانہ سماج میں پنپنے والے جرائم کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان طبقاتی کشمکش کے ذریعہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ محنت ومشقت کرنے والا پس ماندہ طبقہ بھی اپنی عزت نفس کو پہچان سکے اور استحصال کرنے والے سرمایہ دار بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں۔

مجموعہ کا دوسرا افسانہ ''ریت کی دیوار'' ہے اس افسانے میں آلام روزگار اور مسائل سے گھری ہوئی زندگی ہمارے سامنے پوری تلخیوں کے ساتھ بکھری ہوئی نظر آتی ہے موضوع کے اعتبار سے بھی یہ ایک منفرد کہانی ہے جو قاری کے ذہن کو ہر لمحہ اپنی گرفت میں لیے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔

سید احمد قادری ایک جہاندیدہ فنکار ہیں،وہ نفسیات نگاری سے کام لیتے ہوئے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کرداروں کی تخلیق کرتے ہیں،ان کی تجربہ کار نگاہیں معاشرے

کے ہر طبقے، مرد، عورت، بوڑھے، بچے تک پہنچتی ہیں۔

افسانہ ''زنجیر'' عورت کے ان پہلوؤں کے گرد گھومتا ہے، جہاں اس کا وجود آزاد نہیں ہے، اور افسانہ ''دلدل'' ایک طوائف کی زندگی کے المناک تجربوں کی دل شکن داستان ہے۔

''دھوپ کی چادر'' کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قادری نے مکالموں کو فطری رنگ میں پیش کیا ہے۔انہوں نے دیہاتی، شہری، پڑھے لکھے اور ان پڑھ کے مکالموں میں بھی امتیاز برتا ہے، جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ کردار کا تعلق کس طبقے سے ہے۔

بحیثیت مجموعی ''ریزہ ریزہ خواب'' اور ''دھوپ کی چادر'' کے افسانوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیّد احمد قادری اردو افسانہ نگاری میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، انہوں نے اپنے افسانوں میں فن افسانہ نگاری کا پوری حد تک لحاظ رکھا ہے۔ان افسانوں میں انہوں نے جن مسائل کو پیش کیا ہے وہ ہمارے معاشرے کے اہم مسائل ہیں، جنہیں سید احمد قادری نے نفسیاتی نقطۂ نظر کی بنیاد پر پیش کرنے کی بے حد کامیاب سعیٔ کی ہے۔

☆☆☆☆☆

ridden district. Most of his stories have this background. This district is also infested with naxalites. Some of his stories also reflect this reality, particularly his story *"Apni Adalat"*. The Peoples court, as the Naxals call it meet instant and severe punishment to the tyrants who rape the daughter of a landless labourer. *"Star War"* is a simple but very effective story of how a poor present from a village intensly desires for peace and how he meets a violent end at the hands of feudal lords.

Some of Quadri's stories effectively portary the shattering of human values as a result of economic development, urbaniazation and the resultant greed *"Khalij" Aine Ki Gard and Zanjir"* are stories of this category. They portaray how greed makes a person oblivious of all human values in life. He simply thirsts for more and more and disregards completely all finer sides of human life. Inner peace is secrificed at the altar of have more Centred around having. One totally ignores the richness of being and inner peace as the own character of some of his stories like *"Maya Jal"* show.

Each one of his story is an endorsement of human values. His characters are simple ones drawn from towns or villages. Those who migrate to big cities suffer from nostalgia and want to return to their roots. But what Quadri gains in straight narrative his cahracters lack in complexity and inner depth. Manto and Bedi's characters are very complex and inward looking. Quadri's characters often lack inner depth and psychological complexity. But it is not necessarily a weakness. What one gains in swing lacks in round about. Also many writers resort to phantasies, allegories and metaphors or magic realism. They weave a complex plot also. All this makes it difficult to understand the story of the novel. The straight simple but powerful narrative like that of Premchand is, in a way for more effictive in conveying the story and its message. But complexity and inner richness has its own value. One has to choose between the two and Quadri chooses the former as he believes in conveying message and making his sympathies with the oppressed and the exploited quite clear. All stories are therefore quite readable.

(Urdu Alive, Ludhiana, winter issue '97)

Asghar Ali Engineer (Mumbai):-

However this phase is over and the young generation of writers which has now emerged on the literary scence feels committed to positive values of life. Syed Ahmed Quadri, who is among them is quite a perceptive and sensitive showrt story writer. His collection of whort stories ***Dhoop ki Chadar*** is his second collection which was published in 1995. his first collection ***Reza Reza Khawab*** was published a few years ago. The earlier collection also contained some very good short stories. His literary journey upto the second collection of short stories seems to be quite fruitful. He has considerably improved both in his technique and art of narrative.

"Quadri as his stories show, is strong advocate of positive values in life. He believes in commitment to these values. He also hates oppression and exploitations. Of the three categories mentioned above. I will put him in the second one i.e. a critical realist. His deep humanism and sympathy comes loud and clear through each and every story in this collection. Quadri is a very good story teller and keeps his grip in the readers. There are twenty stories in the present collection. Of these I liked ***"Rait Ki Diwar"***. ***"Star War"*** ***"Dopahar"*** and ***"Zanjir"***.

"Rait Ki Diwar" is and honest and yet ruthless portrayal of human circumstances in which he is forced to commit some heinous crimes. In a way it comes close to Premchand's master story "Kafan". Hyatullah Ansari "Man" and Kamleshwar's "Kitne Acche Din". These stories depict the actue povery and ruthless exploitation in our society. It appears nothing has changed in our society since Premchand wrote his master piece "Kafan". We may have made great deal of progress in the field of technology but acute poverty and ruthless exploitation of humans by humans very much persists.

Quadri. I belive draws his experience from the society around him. He can not lie as far as his characters are concerned. It will not ring authentic. One will be greatly shocked to read ***"Rait Ki Diwar"***. A son long unemployed and facing acute poverty, murders his own father by quietly strangulating him in order to get his job. As desire for riches makes man commit henious crimes acute poverty and hunger also force him to do so.

Quadri is from Gaya. Bihar a highly backward and poverty

shattered. Quadri has given a very symbolic ending, when their mother says "Oh, how has this mirror on the dressing table broken......?

Similarly ***Izzatdar, Tashwish, Daldal, Inqualab, Old Peoples Home*** are fine specimens of fusion of matter and expression. In the story ***"Izzatdar"*** Quadri has exposed the hypocrisy of the society where honour has become slave to power and wealth by any means. Auther's son Arshad was a problem child and Akhtar had to face a lot of humiliations by his neighbours. When Arshad in course of time, grew up to be a first ranking goon , everyone was afraid of him and all paid respect to him and his father. In the story ***"Khamosh Saya"*** Quadri has exposed the exponents of art and literature social service who forget the patron who had watered them to flourish and make name and fame. His devotion and sacrifices are but the tales of the past.

The last story of his anthology ***"Old people home"*** is the tragic sage of an old father Tafazul Hussain. Being fed up with the treatment of his younger son, Shamsahd, Tafazul turned to his elder son, Sarwar, a doctor settle in England. After much pursuance, Sarwar sent him money and visa to fly over to England. But after few days Tafazul was treated as intruder and he was sent to an old people Home and was soon forgotten by his son. After this Tafazul returned to India but once again the ill-treating of his youger son and daughter-in-law and illness found him in Govt. Hospital. He began making enquiries from the hospital employees if there was any old people Home? This was but taken as his insanity and here the old People Home was the grave yard. Both of his anthologies were awarded by ***Urdu Academies***.

(THE HINDU)

M. Q. Khan (GAYA)

Most of the short stories of his second anthology of short stories ***"Dhoop ki Chaadar"*** revolve round the presentday buring problem: poverty. tyrannical treatments of haves with haves not. . labour unemployment and unemployed youths. agible parents dowry. upper caste and lower caste confilicts. class and communal riots. He has taken up with all precision the slackness and inactivity of the government officers and administration. flattery of. bribe. hushing up the cases of crime and injustice under the spell of power and pelf There is much hullabaloo regardinig the atrocities lets loose by the Naxalities and M.C.C. but those raise the hue and cry do not like to diagnose who all these have perperated Quadri has shown it in his first story of this second anthology titled ***"Apni Adalat"*** when the daughter of a poor man is forcibly picked up by goons of the land lord and raped. the rage of vendetta surges and the result is what and fear of an unemployed youth who strangles his ailing father for getting a job in his place. The youth gets job and when he returns home. his son Rahul stretches his hands to welcome him and the guilty youth feels those hands advancing to gag his throat. a very starling thought provoking and impressive anti-climax. His third story ***"Khalij"*** deals with dreams of an elder brother. Anwar who educated his younger brother without thinking of his own personal comforts and well-being. The Younger. after graduation gets success in the competition examination and is appointed Income tax officer When Anwar wanted to go about with some of his friends in his youger brother's car. Anwar was stopped tauntingly and stern "Listen this is not your Sahib's Govt.Car" And Anwar's dream

Rafia Kazim (Chennai)

"DHOOP KI CHAADAR" is an insight into the human psyche portraying the inimitable vagaries of human temperament. painting the pictures of the murky affairs of Bihar and its poverty silhouted against the inter-caste rivalry. Quadri is doing a great job for the sake of humanity. If *APNI ADALAT* portrays the traumatic suffering. of the deprived section of the society *RAIT KI DEEWAR* crosses the limit of the barbaric instinct inherent in human beings *RAIT KI DEEWAR* is the most heart sinkening story of how an unemployed youth kills his own father to secure his job on compassionate ground. In most of the stories. the readers indentify themselves with the characters and the circumstances that banboozle them. The stories depict the social milieu of his home state. hence are appealing to the readers.

Meanwhile in order to keep the readers engrossed Quadri has avoided the use of complex words and phrases. as their comulative effect would have watered down the true essence of the stories. Still he has given details that are vivid yet pregnant with thoughtful idias. The stories would have become prosaic had he not made use of local dialect and is rift with ribald. With these two techniques he has made it a serio-comic book. One thing is certain about Quadri's style of narrative and that is it has emerged as the casus belli for the exesting anti social forces.

سید احمد قادری کا پہلا افسانوی مجموعہ

ریزہ ریزہ خواب

(بہار اردو اکاڈمی سے انعام یافتہ)

● صفحات: ۱۶۰ ● قیمت: ۳۵ روپئے ● سن اشاعت: ۱۹۸۵ء

شامل افسانے

✪ شہر خموشاں	✪ آنگن کی بات	✪ لمحوں کی بازگشت
✪ سرخ جوڑے	✪ بند آنکھوں کا سپنا	✪ احساس
✪ منظر یوں تھا	✪ قیدی	✪ یادوں کا المیہ
✪ میں کا میں	✪ انتظار	✪ اجنبی راہیں
✪ خواب	✪ فریب	✪ لمحے درد کے
✪ سسکتے لمحے	✪ فاصلہ قریب کا	✪ کنارہ دور
✪ گمشدہ اجالے	✪ اداسیاں	

سید احمد قادری کا دوسرا افسانوی مجموعہ

دھوپ کی چادر

(بہار اردو اکاڈمی اور اتر پردیش اردو اکاڈمی سے انعام یافتہ)

● صفحات: ۱۴۴ ● قیمت: ۵۷ روپئے ● سن اشاعت: ۱۹۹۵ء

شامل افسانے

✪ اپنی عدالت	✪ ریت کی دیوار	✪ خلیج
✪ عزت دار	✪ آئینے کی گرد	✪ ہنسانے والے
✪ تشویش	✪ دلدل	✪ انقلاب
✪ کوئی صدا نہیں	✪ ہم قدم	✪ اشاروار
✪ مایا جال	✪ زنجیر	✪ دوپہر
✪ خاموش سایہ	✪ سائے کا تعاقب	✪ ایک بچوئیشن
✪ آگ سے روشنی	✪ اولڈ پیپل ہوم	

rekhta
PAANI PER NISHAN
(Short Stories)
by : Syed Ahmad Quadri
ISBN
81-902397-1